

نیک سیرت بیٹیوں کا سفر

رات کی تاریکی میں بجلی بند ہونے پر دولڑکیاں چھپ کر کسی شادی میں شرکت کرنے نکلتی ہی۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتیں۔ شادی والے گھر میں جنرل جلا دیا جاتا ہے جس سے بھاگنے پر لڑکی کی چادر درخت سے اٹک جاتی ہے۔ ایک شخص بڑی حیرانی سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھتا ہے جو چادر چھوڑ کر بھاگ گئی۔

پرفیوم گیلری میں شاپنگ کے بعد اس پر آشکار ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیک میں پیسے رکھنا بھول گئی ہے۔ شرمندگی سے عرق عرق ہوتے ہوئے اچانک ایک شخص آگے آ کر اس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ وہ اسے اپنا نام شائلہ بہادر خان بتاتی ہے جبکہ لڑکا اپنا نام خضر بتاتا ہے۔ خضر کو احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ کس سے مل رہا ہے۔

مولوی حیات دین دار اور نفیس انسان ہیں۔ مسجد امام ہیں اور لوگوں میں ان کی بہت عزت ہے۔ مولوی حیات کی دو نیک سیرت بیٹیاں تاجور اور شکیلہ ہیں۔ وہ ان کے فرائض سے اپنی زندگی میں سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔

صدام اپنے دوستوں کے ساتھ کسی قصبے میں شادی میں شرکت کرنے گیا ہے۔ ایک صبح کچھ مبہم آوازوں کے تعاقب میں اسے ایک پری پیکر لڑکی نظر آتی ہے۔ صدام دل پھینک شخص ہے۔ وہ صبا خان کے حسن کے آگے دل ہار دیتا ہے۔ حاکم دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ حاکم کے مزاج میں حاکمیت اور سختی ہے۔ وہ اپنی چچا زاد تاجور سے منسوب ہے جو مولوی حیات کی بیٹی ہے۔ حاکم کی ماں تاجور کی بہن شکیلہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے چاہتی ہے۔ حاکم اور مولوی حیات کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔



شمالہ بہادر خان انتہائی خوب صورت اور ملک کی معروف مصنفہ ہیں۔ خضر اور اس کے یونیورسٹی فیلوشمالہ کے ناولز کے مداح ہیں۔ یونیورسٹی میں پلے ہو رہا ہے جس کے دوران انہیں علم ہوتا ہے کہ شمالہ بہادر خان مثل بہشت نامی گاؤں نے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دراصل خضر کا بھی گاؤں ہے۔ اچانک خضر کو یاد آتا ہے کہ وہ شمالہ بہادر سے شاپنگ مال میں مل چکا ہے۔ سب کو زوردار جھکا لگتا ہے۔ خضر اس اتفاق پر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مولوی حیات کا دروازہ بچتا ہے تو شکلیہ کھلتی ہے۔ باہران کا خالہ زاد دنگیر موجود ہے۔ شکلیہ اسے باب کی موجودگی میں آنے کا کہتی ہے، وہ مسکرا کر جانے لگتا ہے کہ حاکم دیکھ لیتا ہے اور فوراً شک و شبہات میں گھر جاتا ہے کہ دنگیر کا اس کی منگیتر یا پھر دوسری بہن کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔

سیسی اور ثانیہ دو بہنیں ہیں۔ ان کی اور تایا جان کی فیملی ساتھ میں رہتی ہے۔ تائی جی سیسی سے خار کھاتی ہیں۔ صدام صبا خان سے ملنے رات کی تاریکی میں اس کے گھر جا پہنچتا ہے۔ صبا خان اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ وہ اسے پروپوز کرنا چاہتا ہے کہ تب ہی زور سے دروازہ بجا۔ صبا بوکھلا کر اسے فوراً نکل جانے کو کہتی ہے۔ وہ آنے والے شخص کو اپنا شوہر بتاتی ہے۔

حاکم نیلم کو کہتا ہے کہ وہ تاجور کو حاکم سے ملاقات کا پیغام جا کر دے۔ حاکم نکاح سے قبل تاجور کے کردار کو جانچ کرنا چاہتا ہے۔ تاجور حاکم کی خواہش جان کر دکھی ہو جاتی ہے اور مولوی حیات کو اعتماد میں لے کر ان کے ساتھ حاکم سے ملنے اس کے گھر چلی جاتی ہے۔ حاکم تاجور کے اس قدم پر شدید بے یقینی اور خجالت کا شکار ہو جاتا ہے۔

سیسی اپنے تایا زاد معین سے بچپن سے منسوب ہے۔ سیسی کے بزرگ لڑکیوں کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں البتہ شمالہ بہادر کے گھر جانے پر زیادہ پابندی نہیں۔ شمالہ اور سیسی گہری سہیلیاں ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم۔ دونوں کے درمیان کہانیاں لکھنے سے لے کر ہر چھوٹی بڑی بات ڈسکس ہوتی ہے۔ دونوں میں کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ تاجور کی شادی حاکم سے انجام پا جاتی ہے۔ شادی کی پہلی رات حاکم اپنی شکی طبیعت کے باعث تاجور سے دنگیر کے متعلق اس کے کردار پر سوال اٹھا کر بے حد دکھی کر دیتا ہے۔ وہ اس کی صفائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بہت سے احکامات دیتا ہے۔

خضر شمالہ کو کتاب بھیجنے کی آڑ میں ایک خط لکھ کر اس سے ملاقات کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ صدام جو کہ حاکم کا بھائی ہے۔ نکاح کی ترغیب دینے پر اپنے دوست سے تلخ کلامی کر بیٹھتا ہے۔ بات ہاتھ پائی پر جا پہنچتی ہے اور اس کا دوست اپنی بے عزتی پر صدام کے کردار کی سیاہی سب کو دکھانے کا عہد کرتا ہے۔ حاکم کڑے تیوروں کی ساتھ مولوی حیات کے گھر جاتا ہے اور اپنے بھائی پر لگے الزاموں کی نفی کرتا ہے۔ مولوی حیات اسے صدام سے باز پرس کرنے کا کہتے ہیں تو وہ شکلیہ کی کردار کشی کرتا ہے۔ شکلیہ سخت لہجے میں صدام سے شادی سے انکار کر کے حاکم کو گھر سے نکل جانے کو کہتی ہے۔ حاکم غصے سے پاگل ہو کر تاجور پر زور ڈالتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو سمجھائے یہ رشتہ کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا۔ بات اس کی غیرت اور انا پر آ جاتی ہے۔ شمالہ اپنے والدین اور بھائی کے شہر جانے پر خضر سے ملاقات گھر کی بیٹھک میں کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ خضر کو کال کر کے دن اور وقت بتاتی ہے۔

حاکم تاجور کو لے کر مولوی حیات کے گھر جاتا ہے تو وہاں دنگیر اور اس کی ماں کو پہلے سے موجود دیکھ کر اس کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مولوی حیات بہانہ کر کے اس کے بھائی کی منگ دنگیر کو دینا چاہتا ہے۔ تناؤ بھرے ماحول میں حاکم دنگیر پر ہاتھ اٹھاتا ہے اور دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے۔ تاجور اپنے والد سے کچھ نہیں کہتی، وہ چاہتی ہے شکلیہ کے لیے انہیں جو مناسب لگتا ہے، وہ کھل کر فیصلہ کریں۔

مولوی حیات حاکم کے گھٹیا کلمات سن کر اسی وقت شکلیہ کا نکاح دستگیر کے ساتھ کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ حاکم بھی اعلان کرتا ہے کہ تاجور نے زندگی بھر باپ کو اپنی شکل دکھائی تو وہ اسے تین طلاقیں سے حرام سمجھے گا۔ ایک بیٹی کا تعلق باپ سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ حاکم اس واقعے کے بعد تاجور کو خوب مارتا ہے اور ظالمانہ سلوک کرتا ہے۔

شمریز ثانیہ کے لیے ایڈمیشن فارم لاتا ہے اور اسے تسلی دیتا ہے کہ وہ اس کے والد سے آگے پڑھنے کی اجازت دلوائے گا اور اس کی ہر خواہش پوری کرے گا۔ دلی جذبات کے ہاتھوں اسے ثانیہ کی خوشی بہت عزیز ہے۔

اتوار کے روز خضر شائلہ سے ملاقات کے لیے اس کے گھر آتا ہے۔ یہی وہاں موجود ہوتی ہے مگر سامنے آنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ملاقات کے دوران خضر کی نظر لان میں ٹہلتے پرندے کے پاس بیٹھی سیکی پر پڑتی ہے۔ خضر کی طرف اس کی پشت ہے اور اس کے لیے گھنے بال اس کے چہرے اور پورے وجود کو ڈھانپنے ہوئے ہیں۔ خضر مبہوت رہ جاتا ہے۔

خضر کی ملاقات شائلہ کے گھر میں سیکی سے ہوتی ہے۔ وہ اسے پہچان جاتا ہے۔ سیکی شائلہ کے پوچھنے پر بتاتی ہے کہ خضر سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ چھپ کر اپنی دوست کے ساتھ رات کے اندھیرے میں شادی میں جاتی ہے اور وہاں اس کی چادر رہ جاتی ہے۔ اور پھر ڈیڑھ سال بعد وہ اسے دوبارہ کچن کی کھڑکی میں نظر آتی ہے، جب اسے بچھونے کا ٹلیا تھا۔ سیکی اس کی مدد کرتی ہے۔

شکلیہ کی شادی دستگیر سے ہو جاتی ہے۔ تاجور شریک نہیں ہوتی۔ شکلیہ کی ضد میں اسی دن صدام کے گھر والے اس کی شادی بختاور سے کر دیتے ہیں۔

بختاور تاجور سے کہتی ہے کہ صدام کو کوئی اور عورت پسند تھی۔ بختاور سے شادی صرف اس لیے کی کہ شاید اس عورت کی جھلک نظر آ جائے مگر بختاور صبا جیسی نہیں ہے۔

کرم الہی پینسٹھ سال کا ایک مال دار لیکن بے اولاد شخص ہے۔ اس کی بیوی مرچکی ہے اور وہ دوسری شادی کا خواہش مند ہے۔

تاجور صبح نماز کے لیے اٹھتی ہے تو اسے اعلان سنائی دیتا ہے ”مولوی حیات ولد غلام علی بارضا الہی وفات پا چکے ہیں۔“

تاجور بختاور کے سمجھانے پر اپنے باپ کی میت پر جاتی ہے۔

صدام ہفتوں گھر نہیں آتا اور ڈیرے پر رہتا ہے۔ بختاور اور تاجور میں سگی بہنوں جیسا پیار ہے اور دونوں ہی ماں بننے والی ہیں۔

نیلیم کی شادی ہو جاتی ہے۔ حمیدہ نکلے پر گر جاتی ہیں۔ ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور شدید فالج کے حملہ کی وجہ سے وہ معذور ہو گئی ہیں۔

ایمر جنسی کی صورت میں صدام ہاسپٹل جاتا ہے تو اسے وہاں صبا نظر آتی ہے۔

حاکم ہاسپٹل کے باہر کھڑا ہے۔ ڈاکٹرنی اس سے آکر کہتی ہے کہ ہم آپ کی بیوی کو نہیں بچا سکے۔

نویں قسط

سرما کی گلابی دھوپ میں سیکی چولہے میں بیٹھی بخنی تیار کر رہی تھی۔ آگ کی حرارت سے اس کی رگت سرخ ہو کر دمک رہی تھی۔ بخنی اُتار کر اُس نے لکڑیوں کو بیچ کر اس پر پانی ڈالا تو وہ کیلا سا دھواں

فضا میں لہرائے لگیں۔ تائی جی بچیوں کے ساتھ لہپیں ملنے لگی ہوئی تھیں، سیکی نے صاف برتن میں بخنی انڈیل کر اٹھایا اور خود معین کے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ اماں نے اس کے زخموں کو دیکھ کر اس کی

خوراک کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی ہوئی تھی۔
سیسی دو پٹا درست کرتی اندر داخل ہو گئی تو معین
نے کسی سوچوں میں کھوئے ذہن کو سمیٹ کر توجہ اس
کی جانب مبذول کی۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی اسی کے
پاس آرکی تھی۔

”یہ بخنی پی لو..... دیسی چوزے کی بنائی ہے۔“
”بہت مہربانی آپ کی۔ مجھے لگا تھا میں تو کسی
کو بھول ہی گیا ہوں..... وہ دھیرے سے جتا گیا۔
سیسی چونکی۔ ”کس کو؟“

”ہیں کوئی..... جن کے دھیان میں ابھی تک
بے خبری ہے۔“

”صبح شام تو ہر کوئی تمہارا ورد کر رہا ہے، جیسے
اس سے پہلے کسی کا ایکسڈنٹ ہوا ہی نہیں۔“ سیسی اُٹھ
آنے والی مسکراہٹ دبا گئی۔

”کیا مطلب! اب تمہیں اس سے بھی مسئلہ
ہو رہا ہے؟“ ایک شکن بن گئی ماتھے پر۔

”مجھے کیوں مسئلہ ہوگا، شکوہ تو تم کر رہے
ہو..... میں نے تو تمہارے کمرے کی رونقیں دیکھ کر

سچائی بتائی ہے۔“
”تمہارا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ کسی بیمار شخص کی

مزاج پڑی تو ثواب کا کام ہے۔“
”اچھا آپ بیمار ہیں؟“ سیسی نے بھنویں اٹھا

کر مصنوعی حیرانی سے جملہ خاصا لمبا کھینچا تھا۔ معین
نے گھورا.....

”جو بھی ہوں.....“
”پھر تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ

جو باہر سے برتن ڈھکے ہوئے آتے ہیں اور پھر خالی
صفا حٹ واپس ہو جاتے ہیں، اس خدمت پر مجھے ہی

مامور کیا گیا ہے۔“ سیسی کے لہجے میں کوئی فخر سا
جھلک رہا تھا..... معین کو جو سچا مذاق لگا۔

”میں پہلے ہی کہتا تھا کہ میرے لقموں پر ہمیشہ
تمہاری نظر رہی ہے۔ تم تو ابھی کہنے سے نہیں

چوکتیں..... بعد میں تو.....“ وہ کچھ تیز سا کہتا کہتا
اچانک چپ ہو گیا۔ سیسی کو اس کے خاموش ہونے پر

ہنسی آگئی۔
”کوئی بات نہیں! آپ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے
ہوں گے۔ ویسے بھی آپ کی والدہ حضور کے نزدیک
تو نجانے کتنی نظریں ہیں میری آپ پر، جو وقت بے
وقت تیر کی طرح لگ جاتی ہیں۔ اب آرام سے بخنی
پی لو اس سے پہلے کہ.....“ سنجیدہ بات کو مزاح کے
پیرائے میں لپیٹ کر وہ آخر میں دھیرے سے ہنسی
ٹھکی۔

معین کو اس بات کی چھین پوری طرح محسوس
ہوئی۔

”اچھا یعنی تم انکار کر رہی ہو اپنی بات
سے..... ابھی ابھی میرے سامنے تم نے اقرار کیا ہے

کہ میں بہت کھاتا ہوں۔“
”اس کی فکر نہ کریں، بندہ مریض ہو تو بھوک تو

لگتی ہے نا۔ آپ تو دل پر ہی لے گئے.....“ وہ کہاں
باز آنے والی تھی۔ بڑی معصومیت سے اپنی بات کو

پلٹ دیا۔
”رُک!“ اُسے پلٹتا دیکھ کر معین نے سنجیدگی

سے ٹوکا۔
”ہوں؟“ سیسی کے چہرے پر اپنی کبھی بات کا

شائبہ تک نہیں تھا۔
”اگر خدمت کرنے کا احسان جتا ہی دیا ہے تو

مجھے سیدھا بٹھا دو۔ بازو بہت درد کر رہا ہے اور کمر
بھی..... تکیہ ٹھیک کر کے ٹیک لگانے میں مدد کرو۔“

وہ سنجیدگی سے حکم دے رہا تھا۔
سیسی نے کچھ ضبط سے اسے دیکھا۔ لیکن

بجائے کچھ کہنے سے صبر کا گھونٹ بھرتی آگے آئی۔
معین کو ہلکا سا سہارا دے کر تکیہ درست کیا۔

پھر بخنی کا باؤل قریب رکھ کر چمچ ہاتھ میں دیا۔
”رُک جاؤ! پہلے پانی لے کر آؤ۔“ وہ ہنوز

سنجیدگی سے بولا۔ سیسی نے پانی حاضر کر دیا تو اگلا حکم
صادر ہوا۔

”ہاتھ کون دھلوائے گا، کیا ایسے ہی شروع
کر لوں؟“ سیسی جاتے جاتے پھر پٹی۔

قصور ہے ہی نہیں وہ مجھ پر کیوں تھوپا جا رہا ہے۔ اپنے بارے میں ”منحوس“ کا لفظ اعزاز میں وصول کر لینے والوں کو کیسا لگتا ہے اس کا اندازہ تمہیں نہیں ہو سکتا..... اور میں نے کیا کہا ہے؟ تمہارے سامنے اگر میں کچھ ہنستے ہنستے کہہ دیتی ہوں تو تمہیں وہ بھی برا لگ جاتا ہے اور مجھے اپنے رشتے کا سیاق و سباق از سر نو سننا پڑتا ہے۔ ہم دونوں طرف کے کس مقام پر کھڑے ہیں معین؟“

وہ ہاتھ سینے پر لپیٹ کر جواب طلب نظروں سے معین کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کا انداز چیختا ہوا تھا، نہ ہی لہجہ جھنجھلایا ہوا..... وہ صرف گہرے ٹھہراؤ سے پوچھ رہی تھی۔ معین کی نگاہوں کا ارتکاز ٹوٹنے میں وقت لگا۔

”تمہارے پاس ہر بات کا اپنا فلسفہ ہو سکتا ہے یہی! مگر میں ہر معاملے کو سادگی سے دیکھنے کا قائل ہوں۔ ظرف بہت بڑا لفظ ہے، کیا اپنوں کی کسی بات کو نظر انداز کرنے کے لیے بلند ظرف چاہیے؟ اولاد کا فرض ہوتا ہے والدین کی ہر بات ماننے ورنہ چپ رہنے کا..... تم انہیں ماں سمجھ لیا کرو۔ میں چاہتا ہوں تمہیں اذیت نہ ملے۔“

”معین.....“ یہی بے ساختہ بولی۔ ”تم دو ٹوک اندازے لگانے کے قائل ہو۔ میں تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکتی کہ میں ان کی عزت کرنی ہوں یا نہیں..... مگر میں ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ اس موضوع کو ایک طرف پر رکھ دو۔ تم نے آگے کی زندگی کی بات کی ہے..... کیا ابھی تم نے سوچا کہ میری چھوٹی سی چھوٹی بات تمہیں ناپسند آتی ہے۔ اگرچہ وہ صحیح بھی ہو..... لیکن تم سننا گوارا نہیں کرتے۔“

”وہ اس لیے کہ.....“

”دو لوگوں کی زندگی میں توازن تب رہتا ہے جب آپ دوسروں کو سننے والے بنیں۔ اسے سمجھ لیں، اگر اُس کا دفاع نہیں بھی کر سکتے تو بعد میں اُسے برا بھلا سنانے کے بجائے برداشت کر لیں کہ کسی طرح اُس کے غبار کو بھی باہر کا رستہ ملے..... بے

تم نے ہاتھ ڈال کر کھانا ہے؟ کہنے کی شدید خواہش ہوئی مگر وہ دل میں ہی جواب دے کر ایک ہاتھ دھلوا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”ہوں! ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ کچھ رضا مند نظر آیا تو یہی نے لب کشائی کی۔

”ویسے ایک بات کہوں؟“

”کہو۔“

”تم اتنے بھی کوئی بستر پر نہیں پڑے جتنا بچوں کی طرح ایک ایک کام کروا رہے ہو..... یہ لاڈ ذرا اپنی اماں سے اٹھوا کر دکھاؤ۔“ وہ بھی کہے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ معین زیر لب مسکرایا۔ یہی کو تنگ کرنے کے طریقے.....

”کیوں..... یہ خدمت کرنے کے دعوے تو تمہاری طرف سے نہیں نشر ہو رہے۔ اتنے میں ہی تمہاری برداشت جواب دے جاتی ہے۔“ معین نے اُسے کچھ لا جواب سا کر دیا۔ کندھے جھٹک کر یہی نے گہری سانس خارج کی۔

”میرا مطلب ہے کہ کچھ زیادہ ہی سیریس لے رہے ہو۔ خیر کچھ اور کھانا ہو تو میں باہر ہی ہوں۔“ وہ اب یہاں سے جانے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔

”میں نے کچھ کہنا تھا.....“

”جی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ جیسے جانتی ہو کہ معین نے کچھ کہنا ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا دل دکھا ہے، اماں کی باتیں تمہارے لیے مناسب نہیں تھیں۔“

”شکر ہے! کسی کو تو احساس ہوا.....“ وہ دوسری سمت دیکھنے لگی۔

”پہلے کب نہیں تھا تمہارا احساس۔“ معین چڑ گیا۔ ”تم بخوبی واقف ہو ان کی عادت سے، پھر بھی دل میں بات رکھ لیتی ہو..... اس طرح سے رشتوں میں دراڑیں پڑتی ہیں، تم اچھی طرح سمجھتی ہوں اپنے اور ان کے مابین رشتے کو۔“

”رشتے میں دراڑیں تب پڑتی ہیں جب میں بھی آگے سے انہیں جواب دینے لگ جاتی کہ جو میرا

شک کہ یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں مگر.....“ وہ بولتے بولتے لمحے بھر کوڑکی۔ معین سوالیہ نگاہوں سے اُسے جانچ رہا تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔
”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

”کیا تم مجھے یہ سوچنے پر مجبور نہیں کر رہے کہ ہم دونوں کی آنے والی زندگی کیسی ہوگی..... کسی کی جھڑکیں اور تمہارے ماتھے پر اضافہ کرتے بل، ایک گھٹن زدہ ماحول..... میرے پاس کاش تمہارے جیسی آنکھ ہوتی کہ میں زندگی کو سادگی سے دیکھتی۔ لیکن مجھے اپنی آنکھ سے زندگی بہت پیچیدہ نظر آتی ہے، بہت گنجلک نجانے کیوں.....!“

ماحول بو جھل سا ہو رہا تھا۔ معین کے لیے بولنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اُس کا مقصد ہمیشہ بات ختم کرنے کا ہوتا تھا، مگر شاید اُس کے پاس بات کرنے کا ڈھنگ نہیں تھا۔ بحث سمیٹنے کا سلیقہ..... یہی ہمیشہ جیت لیتی تھی۔ یا پھر وہ انسانی جذبات نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ صرف بن دبا کر سب ڈیلیٹ کر کے مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ سلیٹ پر ہاتھ پھیر کر ہر نقش مٹا دینے کی جستجو..... حالانکہ دل بھی سلیٹ تو نہیں ہو سکتا۔

”یہی.....“ اس کی بے بسی محسوس کر کے اُس نے پھر سے اُسے جانے سے روکنا چاہا تھا۔ وہ خود کو نہیں بدل سکتا تھا، مگر یہی کاغذ تو نکالنے کی کوشش کر سکتا تھا..... شاید! ”میں جانتا ہوں وہ ہم دونوں کے لیے ایک اہم دن تھا۔“ معین اس کی پشت پر بکھرے ریشمی سے بالوں میں الجھتا کہہ رہا تھا۔
یہی نے زور سے آنکھیں میچ لیں..... دو آنسو ٹوٹ کر انمول ہو گئے تھے۔

”ہم دونوں کا زندگی برتنے کا طریقہ کار الگ الگ ہے۔ ہم دونوں مختلف انسان ہیں، مگر مجھے پتا ہے تم بہت اچھی انسان ہو..... ہم دونوں بچپن سے جانتے ہیں کہ ہم دونوں کا نصیب ایک ساتھ لکھا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے تم سے ایسی باتیں کرنے کے

بجائے رعب جھاڑنے کی عادت ہے۔ اور تم نے بھی کبھی رعب میں آنے سے انکار نہیں کیا نا.....“
”مجھے اس کا اختیار ہی کب ملتا ہے۔“ عجیب سی مسکراہٹ یہ سوچ اس کے لبوں پر ڈال گئی تھی۔
”یہ میری غلطی تھی کہ ہم دونوں کا وہ دن خراب ہو گیا۔ شاید اس میں بھی کوئی اچھائی ہی ہوگی..... سچ بتاؤں تو میں نے بھی اس دن کو لے کر خواب نہیں دیکھے۔ لیکن تم نے تو وہ خواب سجائے ہوں گے..... لڑکیوں کے تو ارمان ہوتے ہیں نا، میں نے سنا ہے۔“ وہ آخر میں وضاحتی لہجے میں بولا۔
”یہی کو بے اختیار ہنسی سی آگئی۔ دو آنسو اور ٹوٹ کر گرے، غبار دھو گئے۔

”اس کے باوجود تم مجھے قبول ہو۔ تم مجھے بری نہیں لگیں کبھی، نہ تمہاری حرکتیں نہ باتیں..... لیکن یہ شاید میرے اندر کا مرد ہے جو حاوی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں..... میں بھی تو تمہیں پسند ہوں گا ناں؟“ معین کچھ ہچکچا گیا..... اور ہلکا سا گھبرا گیا۔ پہلی مرتبہ، شاید کمزور لمحے کے ہاتھوں اُس کا دل پھل رہا تھا۔ وہ ایسی کیفیت کا شکار ہو رہا تھا..... یہی اسی طرح رُخ موڑے کھڑی تھی۔

”دومنٹ کے لیے بیٹھ جاؤ۔“ اس بار حکم نہیں تھا، نرم سی گزارش تھی۔ یہی نے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں صاف کیں اور گلا صاف کیا۔ اُسے ٹانگہ سے کبھی اپنی باتیں یاد آ رہی تھیں.....

”نہیں! میں جاتی ہوں..... نجانے پھر کون سا الزام آ جائے۔“

وہ سرعت سے اس کی نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ معین ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کی ایسی باتوں پر بھی یہی کا یہ جواب کیوں تھا؟..... وہ کتنا سہتی رہی ہوگی کہ اس کی محبت کا جواب نہ لوٹا سکی۔ سامنے دھرے بخنی کے پیالے میں بخنی ہلکی ہلکی رہی تھی۔ معین کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

☆☆☆

رات کے تمام سناٹے حاکم کی ذات نے

سمیٹ لیے تھے۔ وہی گھر تھا اور وہی ویرانی کا عالم..... لیکن آج کچھ ایسا ہو گیا تھا جس نے شاخ سے یقین کا ہر پتہ نوج کرا سے عریاں کر دیا تھا۔ خالی ٹہنی باقی رہ گئی تھی۔ اس پر بھی ”باقی“ کچھ نہیں رہا تھا۔

حمیدہ بری طرح رو رہی تھی۔ آدھی رات کا سماں تھا، صدام نے اُن کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے اور بار بار چوم رہا تھا۔ لیکن حاکم چپ تھا۔ بالکل خاموش، تاثر سے عاری چہرہ..... تاجور کو دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ حاکم کچھ نہیں بول رہا تھا، کچھ نہیں دیکھ رہا تھا..... وہ خود فراموشی کا ایسا عالم تھا جس نے حاکم سے اپنا آپ بھلا دیا تھا۔

تاجور اپنی جگہ سے اٹھی تو اُسے حرکت میں آتا دیکھ کر حاکم نے نگاہیں اٹھائیں۔ صرف ایک نظر تاجور پر ڈالی۔ خالی خالی اور بے معنی سی..... پھر جھکا لی۔ تاجور ابھتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

”حاکم کی حالت اتنی غیر ہو رہی ہے اماں کی طبیعت پر..... دل میں دکھ چھپا رہے ہیں۔“ وہ افسوس سے سوچتی ہوئی برآمدے میں ٹھہر گئی۔ اُسے لگا محسن میں پڑی چار پائی پر کوئی موجود ہے۔ سیاہ سا ہیولا، اتنا باریک جیسے.....

”کوئی عورت.....“ تاجور بڑبڑائی۔ اس وقت چپ چاپ کسی کا اس کے گھر میں موجود ہونا اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے قدم بڑھائے اور عین اس ہیولے کے سر پر پہنچ گئی جو کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

”کون ہو تم؟“ تاجور کے سوالیہ انداز پر اُس نے سر اُپر اٹھایا اور تاجور کو دیکھا۔

”میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا، تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ اُسے خاموشی سے دیکھتا پا کر تاجور نے دوبارہ سوال کیا تھا۔ اس مرتبہ بھی وہ اندھیرے میں تاجور کو گھورتی رہی، پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑے۔

”تم یقیناً حاکم کی بیوی ہو؟“ اس کے لہجے میں

یقین بھی تھا اور سوال بھی..... تاجور نے بے ساختہ سر ہلا کر جواب دیا۔

”جی۔“

”یعنی صدام کی بھابھی.....“ اُس نے ایک ہی بات گھما کر کی۔

”ہوں۔“ تاجور کی الجھن دو چند ہو گئی تھی۔ بڑے اطمینان سے وہ اس کے رشتے گنوار ہی تھی جسے تاجور پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔

”ہوں..... تم مجھے نہیں جانتیں۔“ ہاتھ پیچھے کو نکا کر وہ سکون انداز میں بولی تھی۔

”میں صبا خان ہوں.....!“ اس پر نظریں ٹکائے ٹکائے وہ دھیرے سے بولی۔ تاجور کے چہرے پر نا فہم سے تاثرات پھیلے رہے۔

”تم سے میرا تعارف ہے..... تمہاری جھٹائی۔“ اک توقف کے بعد پُر لطف لہجے میں اس نے اپنا درجہ بیان کر دیا تھا۔ تاجور فوری طور پر سمجھ نہ سکی۔

”جھٹائی؟“ اس کے لبوں سے بے یقینی سے لفظ سرسرایا۔ صبا کے تعارف نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے..... اس نے تیزی سے سر گھما کر اس کمرے کی جانب دیکھا جس میں خاموش بیٹھے حاکم کے گرد سائے شور کر رہے تھے۔

☆☆☆

”تم ناراض ہو مجھ سے حاکم؟“ صدام نے حاکم کو اٹھتے دیکھ کر خود سے پہل کر لی تھی۔

تاجور کے اندر کو بڑھتے قدم ٹھم گئے۔ یہ رات تمام نفوس نے آنکھوں میں کالی تھی، نیند کسی پر مہربان نہ ہوئی..... حمیدہ کی طبیعت رات کے آخری پہر سنسبھل گئی جب سب نے موت کی آہٹیں قریب سے سن لی تھیں۔ لیکن زندگی کی ڈور مضبوط ہو گئی..... اُجالا ہلکا ہلکا پھیل چکا تھا جب مضطرب سی تاجور نے یہ آواز سنی۔

”میں تم سے کس وجہ سے ناراض ہو سکتا ہوں۔“ حاکم نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ جیسے

اپنے سارے حق اُس نے گزشتہ شب اٹھالیے ہوں.....!

”تم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہارا حق ہے کہ.....“

”میرے حق کی بات نہیں ہے۔ یہ تمہاری زندگی ہے، میں نے کچھ زیادہ ہی دخل اندازی کر دی تھی، اس کا میرے پاس افسوس کا بھی وقت نہیں بچا۔“ حاکم کا لہجہ ٹوٹا سا لگ رہا تھا، کچھ بجتا ہوا، توڑ پھوڑ کا شکار..... تاجور سانس روکے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔“ صدام ہلکا سا مسکرا دیا۔ حاکم کے چہرے پر تناؤ سادر آیا تھا۔

”میں نے تم سے کہا نا، مجھے اس سلسلے میں بات نہیں کرنی ہے۔“

”یہ تو پھر ناراضی والی بات ہوئی نا، تم میرے بھائی ہو تمہیں سب معلوم ہونا چاہیے۔“ صدام نے نرم لہجے میں اہمیت جتائی۔ وہ اس کے دل میں اُترنے کا فن جانتا تھا۔

”اس کے لیے دیر نہیں ہوگئی؟“ ناچاہتے ہوئے بھی لہجہ تلخ ہوا۔ تاجور نے بھی محسوس کیا تھا۔

”نہیں! کچھ دیر نہیں ہوئی، میں بہت پہلے تمہیں سب بتانا چاہتا تھا مگر مجھے وقت نہیں مل سکا..... شاید اب صحیح وقت ہے۔“ صدام نے ہاتھ ملتے ہوئے خود کو کہنے پر آمادہ کیا۔ حاکم نے رخ موڑ کر صدام کی طرف دیکھا تھا۔

”اب صحیح وقت ہے؟ اب جب کچھ رہا ہی نہیں..... تب کچھ نہیں بتایا جب ایک دنیا یہ ذکر کر رہی تھی، اگر تمہاری کوئی پسند تھی تو چپ رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تب بھی نہیں جب مولوی چچا سے میں قطع تعلق کر رہا تھا..... مولوی چچا کو میری وجہ سے.....“ حاکم کی آواز دکھ کے احساس مدہم پڑ گئی تھی۔ وہ بڑے بھائی کا لحاظ کر رہا تھا، آواز دبی دبی تھی مگر آنکھوں کے کنارے انتہائی سرخ تھے۔ باہر کھڑی تاجور کے حلق میں پھندہ سا بن گیا..... ایک

تند و تیز لہر اُس کے جسم کے آر پار اتر گئی تھی۔

”مولوی چچا؟ تم پھر غلط سمجھ رہے ہو یا.....“

اگر صبا کورات تم نے میرے ساتھ دیکھ لیا ہے تو اسے پرانی بات سے مت ملاؤ۔ وہ ساری باتیں آج بھی بے بنیاد ہیں۔“ صدام نے سکون سے اس کی باتیں رد کرتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ساری رات اس معاملے پر ہر پہلو سے سوچ چکا تھا، اسے علم تھا بات کو کس رخ پر گرہ لگانی ہے۔

”پرانی بات.....“ تاجور نے اس لفظ کی تلخی کو اپنے اندر اُتارا۔ وہ جس بات کو ”پرانی“ کہہ رہا تھا کوئی تاجور سے پوچھتا کہ اس کا دل آج بھی لہو کے قطرے برساتا تھا۔ ابا کی یاد میں کو کس کرب سے گزرتی تھی، کوئی محسوس کرنے والا نہیں تھا مگر وہ بھول تو نہیں گئی تھی۔

اس کا جسم دھیرے دھیرے لرزنا شروع ہو گیا تھا..... لب سختی سے بھیجے تھے۔ کاش وہ سامنے جا کر اس انسان کا گریبان پکڑ سکتی جواب بھی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر تاجور کو اب ہر انسان کا رخ آئینے میں صاف صاف دیکھتا تھا۔ وہ بھی مر کر بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔

”ہاں بے بنیاد! جانتے ہو صبا مجھے کہاں ملی؟“ وہ مضبوطی سے بولا۔ حاکم نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ کچھ تھا ہی نہیں اس کے پاس کہنے کو.....

”جس روز بختاور نے انتقال کیا، صبا مجھے وہیں ہسپتال میں ملی تھی۔“ اُس نے ذرا سے توقف کے بعد بولنا شروع کیا۔

”وہ بے سہارا اور لاچار لڑکی ہے، اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنی رحم دلی کے ہاتھوں اس کی دیکھ بھال کا ارادہ کیا تھا۔ اور تھوڑے عرصے میں ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی مظلوم اور دھمی ہے۔ میرا گھر ویران ہوا تھا حاکم..... میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں گھر آؤں۔ وقت ہی کتنا بیتا تھا میری شادی کو۔ اور میں کس طرح سامنا کرتا اس ننھی سی جان کا..... شاید یہی وقت ہوتا ہے جب ہمیں

یقین کیا تھا یا نہیں، اُسے کیا صحیح لگا تھا کیا غلط..... مگر اس کی آواز سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔
تا جو ایک مٹی کا بُت تھی۔

”کون سی بات.....“ صدام بری طرح سے جھنجھلا گیا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر برہمی تھی۔
”تمہیں سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا کہ تم دو الگ الگ باتوں کو ایک ساتھ جوڑ رہے ہو۔ میں نے صبا سے نکاح کیا ہے..... وہ شریف زادی ہے، کوئی ایسی ویسی عورت نہیں۔ میں نے اُسے بیوی بنا کر اپنے گھر میں پناہ دی ہے..... کسی پچھلے حوالے کو لے کر مجھ پر کوئی اُننگی نہیں اٹھا سکتا۔“

اُس نے کچھ خفگی کچھ غصے سے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ حاکم نظریں پتیلی کیے فوری طور پر کچھ بول نہیں سکا..... تا جو زخمی نظروں سے دیواروں کو گھور رہی تھی۔ ایک رنج و غم کی سُرخنی اُس کے چہرے پر بھی پھیلی تھی۔ وہ مزید اپنے قدموں پر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ حاکم نے سابقہ انداز اختیار کیے رکھا۔ ”یہ آپ کا گھر ہے، آپ کی بیوی آپ کی عزت ہے..... اور عزت گھر میں رکھی جانی ہے۔ آپ چاہیں تو یہاں رہیں۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔“ حاکم نے یہ بات کی۔

”ہم چلے جائیں گے۔“ صدام نے یہ فیصلہ کیا۔ ابھی کے لیے اتنا بہت تھا، وہ مزید حاکم کو روک کر اپنی بات کا اثر زائل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ..... تا جو رکی حالت سب سے مختلف تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے دیوار کا سہارا لیتی ہوئی واپس مڑی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر ساری چیخیں اندر منجمد ہو گئی تھیں۔ آخر میں وہی ہوا تھا ہمیشہ کی طرح..... جس کی وجہ سے شہر برباد ہوا اُسے کیا فرق پڑا؟ اُس کا دل اُجڑ گیا اور زندگی اجیرن ہو گئی۔ اور دوسری طرف حاکم نے اتنی آسانی سے بات ختم کر دی؟

اُس کے اندر آگ دہک گئی۔ آنکھوں کا پانی

جذباتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ صدام تاسف سے بول رہا تھا۔ جیسے اُس کا دل یہ بیان کرتے ہوئے دکھ رہا ہو.....

حاکم نے نگاہیں اٹھا کر صدام کو دیکھا۔ صدام نے بھانپ لیا کہ اُس کی آنکھوں میں سختی ٹوٹ گئی ہے۔ یا نرم پڑی ہے۔

”مجھے بھی سہارے کی ضرورت تھی اور اُسے بھی..... اس کی صحت یابی کے بعد میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ اُس کا کوئی ٹھکانا نہیں بچا تھا، دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔ اس مشکل وقت میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے حاکم..... ہم دونوں کا دل ٹوٹا ہوا تھا۔“

وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ صبح کا سکوت پورے ماحول پر حاوی تھا۔ حاکم بھی چپ تھا اور تا جو..... اس پر حاکم کی چپ آہستگی سے حملہ آور ہونے لگی۔ صبح کا سکوت اس کے اعصاب پر شکنجے مضبوط کرنے لگا..... حاکم قائل ہو رہا تھا، اتنی آسانی سے؟

”اور رہی بات تمہیں نہ بتانے کی تو میں کیا وضاحت پیش کرتا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا حاکم، زندگی میں آگے بڑھنے کا حق سب کو ہوتا ہے۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو شاید بہت مایوسی میں چلا جاتا۔ لیکن پھر بھی تم جو چاہو میں اس پر عمل کروں گا..... اگر تمہیں میرے اس نکل سے دکھ پہنچا ہے تو میں چلا جاؤں گا تھوڑی دیر میں یہاں سے۔ اور صبا کو بھی لے جاؤں گا..... لیکن میں اب اسے چھوڑ تو نہیں سکتا نا۔ وہ میرے مشکل وقت کی ساتھی ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے چپ ہوا تو حاکم نے بڑی دیر بعد لب کھولے۔

”لیکن اس سب سے وہ بات سچ ہو گئی ہے جو تمہارے نام سے مشہور ہوئی۔ تا جو مجھے کس نگاہ سے دیکھے گی کہ جس بات کو لے کر میں نے اس کے باپ سے بدلجائی کی وہ مجھے ہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی پڑی۔“ حاکم کا لہجہ کمزور تھا۔ نجانے اُس نے

نزدیک صرف اپنی اہمیت ہے بس.....“ وہ ایسے بولنا چاہتی تھی جیسے چیخ رہی ہو۔ مگر اس کی آواز کہیں اندر گھٹ کر رہ گئی تھی۔ آنسو گالوں پر لڑھک رہے تھے مگر یہ غم کے آنسو نہیں تھے..... اُسے پروا نہیں ہو رہی تھی کہ اس کی آواز کہاں تک جا رہی ہے اور کہاں اثر انداز ہو رہی ہے۔

”تاجور! آج معاملہ مختلف ہے.....“ حاکم کی آواز کی طرح اس کا دفاع بھی کمزور تھا۔ تاجور کیلی لکڑی کی طرح چٹنی۔

”صرف اس لیے کہ آپ کے بھائی نے کہا معاملہ مختلف ہے اور آپ ایمان لے آئے؟“ طنز بہت نوکیلا تھا، حاکم کو یہ تمسخر گھاؤ دے گیا۔

”وہ اس کی زندگی ہے.....“

”اور وہ ہماری زندگی تھی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

زندگی میں پہلی بار حاکم اُس کی آواز بلند ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

”آپ سب نے مل کر اسے خراب کر دیا۔ آپ کو کیا حق پہنچتا تھا کہ آپ ہم سب کی زندگیوں کا فیصلہ کرتے۔ آپ کو کس نے کہا تھا کہ مجھ پر تشدد کر کے پابندیاں بٹھاتے، میرے باپ کو ذلیل و رسوا کرتے اور میری بہن..... صرف اس انسان کے لیے جس نے آج آپ کا غرور خاک میں ملا دیا ہے۔

آج میرے ابا کی بات ٹھوس حقیقت بن کر آپ کے سامنے آگئی ہے، اور آپ نے اتنی آسانی سے اسے قبول کر لیا۔ یہ حقیقت آپ نے تب تسلیم کیوں نہیں کی تھی۔“

”صدام نے اُس سے نکاح کیا ہوا ہے۔“

حاکم نے یوں اُسے بتایا جیسے کوئی نئی بات ہو۔ تاجور نے لمحے کا توقف دیا۔

”اچھا.....“ وہ ہنس پڑی۔ آنکھوں سے پانی ٹوٹ کر گرا۔ دل سے جو گرا وہ بانی نہیں تھا۔ تاجور کی ہنسی اس کی بات پر تالی بجانے جیسی تھی۔

”میں کیوں یقین کروں اس جھوٹے انسان

آج دل پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ حاکم چند لمحوں باہر نکلا تو تاجور کو دیوار کا سہارا لیے دیکھ کر ٹھیک گیا۔

وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اندھیرا اتنا تو نہیں تھا کہ اُس کی کیفیت عیاں نہ ہو سکے..... اور جذبات تو بنا دیکھے بھی محسوس ہو جاتے ہیں۔ حاکم نے بے اختیار اُس سے نظریں چرائی تھیں۔ کیوں؟

تاجور اسی پل تیزی سے مڑی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ حاکم بھی کمزور قدموں پر چل کر اس کے پیچھے آیا تھا۔ اُس کا اس وقت کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا جہاں تاجور گئی تھی۔

”بہت مبارک ہو آپ کو.....“ حاکم کو بیٹھتا دیکھ کر تاجور نے نہایت فراخ دلی سے مبارک باد پیش کی۔ اس کی لہجے میں اتنا شور تھا کہ حاکم کو سر اٹھانا پڑا۔

”آپ کا بھائی دنیا کا عظیم کام کر کے آیا ہے، آپ کو تو پوری دنیا کے سامنے یہ فخر کرنا چاہیے۔

حیرت ہے آپ چپ چاپ آکر بیٹھ گئے ہیں؟“ وہ حیرانی و بے یقینی کے لمبے جملے تاثرات دیتی مخلصانہ مشورہ دے رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر تحریر اذیت اتنا چٹ رہی تھی کہ حاکم خالی خالی سا اُسے دیکھے گیا۔

”سنو تاجور.....“

”نہیں حاکم.....“ دو قدم پیچھے ہو کر اُس نے اُنکی کھڑکی کی۔ ”آج نہیں! آج آپ مجھے کچھ نہیں سنائیں گے، آج آپ کچھ بھی سنانے کے قابل نہیں ہیں..... میں نے دیکھ لیا آپ کو، ہوتا ہے میں سمجھتی تھی کہ آپ وہ انسان ہیں جو اپنے یقین سے ایک اچھٹا ہٹا بھی نہیں جانتے۔ اس لیے آپ کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ آپ اپنے بھائی کے بارے میں اتنی گھٹیا بات تسلیم کریں۔ لیکن میں غلطی حاکم، آپ کے اندر تو ایسا کچھ ہے ہی نہیں..... آپ کے اندر صرف ضد ہے۔ صرف ضد اور خود ساختہ انا کے پتھر لیے بت جو آپ کو جھکنے نہیں دیتے۔ آپ کے

آپ کو تو پوری دنیا کے سامنے یہ فخر کرنا چاہیے۔

حیرت ہے آپ چپ چاپ آکر بیٹھ گئے ہیں؟“ وہ

حیرانی و بے یقینی کے لمبے جملے تاثرات دیتی مخلصانہ

مشورہ دے رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر

تحریر اذیت اتنا چٹ رہی تھی کہ حاکم خالی خالی سا اُسے

دیکھے گیا۔

”سنو تاجور.....“

”نہیں حاکم.....“ دو قدم پیچھے ہو کر اُس نے

اُنکی کھڑکی کی۔ ”آج نہیں! آج آپ مجھے کچھ نہیں

سنائیں گے، آج آپ کچھ بھی سنانے کے قابل نہیں

ہیں..... میں نے دیکھ لیا آپ کو، ہوتا ہے میں سمجھتی تھی

کہ آپ وہ انسان ہیں جو اپنے یقین سے ایک اچھٹا ہٹا

بھی نہیں جانتے۔ اس لیے آپ کے لیے یہ بہت

مشکل ہے کہ آپ اپنے بھائی کے بارے میں اتنی

گھٹیا بات تسلیم کریں۔ لیکن میں غلطی حاکم، آپ

کے اندر تو ایسا کچھ ہے ہی نہیں..... آپ کے اندر

صرف ضد ہے۔ صرف ضد اور خود ساختہ انا کے

پتھر لیے بت جو آپ کو جھکنے نہیں دیتے۔ آپ کے

پر، جو اپنے گناہوں پر دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔“

”تاجور.....“ حاکم نے اسے ٹوکنا چاہا۔

”جس نے اپنی بیوی کو کبھی خوش نہیں رکھا کیوں کہ اُسے حلال راس نہیں ہے۔ ابا سچ کہتے تھے، جس بندے کو حرام کی لت لگ جائے وہ نہ کسی کا خوف کھاتا ہے نہ اپنی بیوی کے مرنے کا غم..... یہ بھی وہ ”ویرانی“ جو اسے اپنے گھر نہیں لوٹنے دیتی تھی۔ اس کی کائنات نہیں اُجڑ چکی تھی، بھری جوانی میں کوئی اپنی زندگی سے چلی گئی اور اس سے تین دن کا افسوس بھی نہیں منایا گیا۔“

”ایسے الفاظ استعمال مت کرو۔“ حاکم نے سختی سے آنکھیں میچیں تھیں۔ کچھ نگلا تھا۔

”میں تین حرف بھیجتی ہوں اس کا ذکر کرنے پر بھی.....“

تاجور کی انتہائی سخت بات پر حاکم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ شاید اپنے سامنے اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی تاجور سے..... جو آج تک اس کے سامنے صرف نپا تلا بولتی تھی۔

”لیکن مجھے جواب چاہیے۔ جس بات کو لے کر آپ نے ہماری زندگیوں میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ آج اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھ کر آپ کیسے اس پر مٹی ڈال رہے ہیں۔ کیا یہی ہے آپ کے انصاف کا پیمانہ؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہی تھی۔ حاکم کی شخصیت کو چیلنج کر رہی تھی..... چہرہ بلا کا سرخ تھا۔ آنکھوں میں نیلے نیلے شعلے۔

”اُس نے وہ نہیں کیا ہے..... اس نے ہم سے یہ بات چھپائی ضرور ہے مگر اس نے جائز راستہ اختیار کیا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اسے کرنا تھا۔“ وہ نجانے کس کو بجا رہا تھا۔ اپنے بھائی کو یا خود کو، یا دونوں میں سے کسی کو نہیں..... وہ ٹوڑ پھوڑ کا شکار ہو رہا تھا۔ تاجور کو کوئی چاہ نہیں تھی کہ اس کے لہجے پر غور کرنی۔

”جائز راستہ؟“ وہ ترخ سے بولی۔ ”کس کو

دھوکا دے رہے ہیں حاکم صاحب..... خود کو یا مجھے؟ کیا آپ کو واقعی لگتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ اتنی بچکانہ بات کم از کم مجھے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ایک انسان اپنی بیوی کی موت پر ایک عورت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور پھر فوراً اس کی تیمارداری کے لیے خود کو پیش کر دیتا ہے جبکہ اس کی ضرورت اس کی ”ماں“ کو زیادہ ہے جس کے قریب بھی وہ مارے باندھے بھٹکتا ہے۔ یہ گھڑی گھڑائی کہانی اتنی جھول زدہ ہے کہ خود بول کر بتا رہی ہے..... یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کا پہلے سے کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ بات وہیں چھپائی جاتی ہے جہاں دل میں چور ہوتے ہیں۔ آپ اگر وہاں نہ جاتے نا، تو شاید ساری زندگی بھی وہ اسی طرح آپ کو لالچ رکھتا..... خود پر جان وارنے والے اپنے بہت ”اہم“ بھائی کو..... اس کا وارکاری تھا۔ حاکم کے اندر سے ”اہم“ کا وہم ہی لڑکھڑاہا تھا، تاجور کی بات گویا دونوں ہاتھوں کا دھکا تھی جو اسے گرا کر ریزہ ریزہ کر گئی۔ حاکم ان کرچیوں کی تکلیف سے کراہ اٹھا۔

”میں یہ یقین سے نہیں کہوں گی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا ابا کو بتایا گیا تھا۔ مگر اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ اُس کا وجود بہر حال تھا۔ اسی طرح اس سے بھی ضرور پہلے سے اس کا تعلق رہا ہے جسے کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اپنے پاس لے آیا جیسے راستے کا کانٹا صاف ہو گیا ہو (بخاؤر)۔ کوئی اتنی جلدی کسی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ نہیں کرتا..... وہ بھی تب جب ایک تنہا لڑکی ہو اور دوسری طرف ایک اکیلا مرد..... ہاں مگر اس کے لیے اچھے کردار کا ہونا ضروری ہے۔“ تاجور نے بہت حقارت سے سر جھٹکا تھا۔ حاکم کو بے چینی لاحق ہوئی۔

”بات ختم کرو اب خدا کے لیے.....“

”یہ بات اتنی جلدی آپ ختم نہیں کر سکتے۔ جس بات کو ہمارے گلے کا طوق بنا دیا گیا تھا۔“ آنسو اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئے تھے۔ جیسے اس کی زندگی ایک نقطے پر عرصے سے ٹھہری ہوئی تھی۔

حاکم جھنجھلا گیا۔ ”تو تم کیا چاہتی ہو مجھ سے..... اسے مار ڈالوں کیا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا اُسے بڑا بھائی ہے وہ میرا.....“

”مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟“ ایک مسکراہٹ تاجور کے چہرے پر زخم زخم ہو گئی۔ ”میرے ابا کو جیتے جی مارتے ہوئے آپ نے کیوں نہ سوچا تھا حاکم؟“ وہ بھری بھری آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ حاکم کے دل کو دھکا لگا۔ ہزاروں شکوے تھے ان آنکھوں میں..... گر لاتے ہوئے گلے۔ ایک معصوم سی بچی کی طرح، جو اپنے محافظ سے سوال کرتی ہے اپنے باپ کے حوالے کا.....

”تاجور.....“ وہ ششدر رہ گیا۔ مولوی حیات کی موت پر اور اس کے بعد دونوں میں بھی اُن کا ذکر نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تاجور شاید انہیں بھلانے کی کوشش کر رہی ہے، وہ اپنی زندگی میں توازن لانا چاہ رہی ہے۔ لیکن ایسا تو کبھی نہیں تھا..... نہ وہ مولوی حیات کو بھلانا چاہ رہی تھی، نہ وہ بھولی تھی۔ وہ تو حاکم کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ اس کے سامنے اپنے ابا کا ذکر کرے۔ وہ اسے اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار گردانتی تھی، جب ہی اپنے باپ کی محبت بیان کرنے والے لوگوں کی فہرست میں سے اس نے حاکم کو بلا جھجک خارج کر دیا تھا۔

”مولوی چچا کو..... میں نے نہیں مارا ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی جیسی تھی۔ بیک وقت بھاری اور ہلکی..... مولوی حیات طبعی موت مریے تھے، لیکن تاجور اس کا الزام حاکم کو دے رہی تھی۔ سچ تھا یا جھوٹ، حاکم کو ہلا گیا تھا۔

”مولوی چچا.....“ تاجور کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ بڑی مدت بعد حاکم کو اس رشتے کا پکارنا یاد آ گیا تھا جس کی اس نے ”شان“ برقرار نہیں رکھی تھی۔ پھر قدر یاد آئی بھی تو کس مقام پر..... مضبوط رشتے اور پورا کا پورا انسان کچھ وقعت نہیں رکھتا ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے آگے..... جو ہر لحاظ و مروت بلائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

”انہیں آپ سب نے مل کر مار دیا ہے حاکم..... میرے ابا کو، جو میری کل کائنات تھے۔ سوچیں، دنیا میں آپ کے پاس صرف ایک ہی قیمتی متاع باقی رہ گئی ہو، اور اسے بھی آپ مٹی میں دفن ہوتا دیکھتے رہیں۔ آپ وہ آدم ہیں جس نے مجھے میری جنت سے نکالا ہے۔ میرے باپ کی عمر آپ سب کی پہنچائی اذیت نے بہت مختصر کر دی۔ تصور کر سکتے ہیں آپ، جب وہ آخری وقت میں تاجور، تاجور کرتے دم دے رہے ہوں گے، کیسی حالت ہوگی ان کی..... جب ایک بیٹی نے دیکھا کہ عین اس کے باپ کی موت سے پہلے وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دے رہا ہے۔ ہم لوگوں کا کیا تصور تھا حاکم..... اس تصور سے بڑا تو نہیں ہوگا جو آج آپ اپنے بھائی کو نظر انداز کر کے نظر چرا رہے ہیں۔ کیا وہ سزا میں صرف ہم لوگوں کو تجویز کرنے کے لیے تھیں..... تب کتنی آسانی سے کرتے رہے تھے آپ قتل، جذبات بھی اور انسان بھی.....“

وہ آنکھیں بند کیے وہ اذیت برداشت کر رہی تھی جو اس کے چہرے پر رقم حاکم پڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک بل کو بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں، پہلی بار احساس ہونے لگا تھا کہ کتنا کچھ ہوتا ہے چہروں پر کھوجنے کے لیے۔ کیا کیا داستان نہیں سناتے یہ چہرے..... جن کی کہانیاں ہماری آنکھوں پر پڑی فیصلے کی پٹی ہمیشہ اوجھل کر دیتی ہے۔

”وہ..... وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔“ حاکم نے نظریں جھکا لیں۔ زمین کو گھورنے لگا۔ تاجور نے نئی سے کہا۔

”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے..... یہ گھر بھی آپ کا ہے، یہ رشتے بھی۔“

”تو تم کیا چاہتی ہو..... کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کس پہ یقین کروں کس پہ نہیں، پھر بھی مجھے اختیار نہیں کہ میں انہیں کچھ کہوں، وہ اپنی زندگی کا خود مختار ہے۔ اور تم چاہتی ہو کہ میں تم سے

معافی مانگوں تو ہاں ہوئی ہیں مجھ سے غلطیاں.....
اور.....“

”معافی؟“ تاجور نے درمیان سے بات کاٹی۔ ”میں ہرگز نہیں چاہتی مجھ سے کوئی معافی مانگے.....“ اس کے چہرے پر برہمی آگئی۔ ایک پتھر لی سی سختی۔ وہ بات کو کسی رخ پر لے رہا تھا۔ تاجور یہ واحد چیز تھی جس کی توقع رکھتی تھی کہ نہ ہو۔

”آپ کو لگتا ہے میں معافی کے لیے یہ سب کر رہی ہوں..... آپ غلط ہیں حاکم۔ جانتے ہیں میں کیا چاہتی ہوں؟“ وہ مدہم مگر پراسرار لہجے میں گویا ہوئی۔ حاکم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں چاہتی ہوں زندگی میں کبھی کوئی مجھ سے معافی طلب نہ کرے۔ کیونکہ میں مولوی حیات کی بیٹی ہو کر کم ظرف نہیں کہلانا چاہتی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں معاف کسی کو بھی نہیں کروں گی..... میں کسی کو معاف کر ہی نہیں سکتی۔“

بے لچک اور دو ٹوک انداز تھا تاجور کا۔ حاکم چند لمحے کچھ بول نہیں سکا، اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی سچائی نظر آرہی تھی۔ حاکم نے بدقت کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ اسی وقت ہلکا سا کھلا دروازہ پوری طرح وا کر کے کوئی اندر داخل ہوا۔

حاکم نے ناگواری سے اور تاجور آنے والی کو دیکھ کر گہرے طیش سے سیدھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”آپ ہمیشہ میرے لیے کچھ نہ کچھ ایسا کر جاتے ہیں کہ میں سوچتی ہی رہ جاتی ہوں..... اور پھر آخر میں مجھے سر پرانز ڈھی ہونا پڑتا ہے۔“ شائلہ نے یہ بات کہتے ہوئے اس نازک و نفیس سے چین سیٹ پہ ہاتھ پھیرا تھا جسے وہ نجانے کتنی دفعہ نکال کر دیکھ چکی تھی۔ وہ اپنے لیے بہت کچھ پہلے بھی خریدتی رہی تھی..... اسے بہت قیمتی تحائف زندگی کے مختلف مقامات پر ملتے رہے تھے۔ مگر جتنی اہمیت کا احساس یہ گفٹ اسے دلا رہا تھا، اس قدر پہلے کسی چیز نے نہیں دلا یا تھا۔

”آپ نے صرف مجھے شرمندہ کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ اس میں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے..... خاص بات تو یہ ہے کہ آپ نے اسے قبول بھی کیا اور پسند بھی آیا۔ میری محنت وصول ہوگئی۔“ خضر نے جواب دیا تھا۔ شائلہ پوچھنے لگی۔

”یعنی بہت محنت کرنی پڑی آپ کو؟“

”آف کورس۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”دراصل جب اسپیشل پرسن کے لیے آپ کچھ لیتے ہیں تو دل کسی چیز پر بمشکل آمادہ ہوتا ہے۔ پھر بھی تب تک تسلی نہیں ہوتی، جب تک وہ پسندیدگی کی سند نہ پالے۔“

”آپ کو اپنی چوائس پر بھروسہ ہونا چاہیے۔“

شائلہ محظوظ ہوئی تھی۔ ”اور.....“

”اور؟“ خضر نے اس کے وقفہ دینے پر دریافت کیا۔

”اور مجھ پر بھی..... آپ اگر کسی کے لیے اتنی محبت اور چاہ کے ساتھ تحفہ لے رہے ہیں تو کوئی کیسے اسے ناپسند کرے گا۔ تحفے کی ساری خوب صورتی اور قدر و قیمت دینے والے کی شخصیت پر منحصر کرتی ہے۔“

”پھر تو ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ میں اس کے لیے دلی طور پر خوش ہوں۔“ خضر نے خوش باش لہجے میں اظہار کیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے جا رہے تھے اور اس چیز سے دونوں ہی باخبر تھے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ جب دونوں ایک دوسرے سے بات کیے بغیر گزار دیتے ہوں۔

”یہ میرے لیے یادگار تحفہ ہے خضر! اس کے لیے ایک مرتبہ پھر شکریہ۔“

”آپ کے لیے یہ یادگار تحفہ نہیں ہے۔ آپ کے لیے یادگار کچھ اور ہونے والا ہے۔“ خضر نے لفظوں پر زور دے کر اس کے تجسس کو ہوا تھی۔

”سچ میں.....“ شائلہ ایک دم ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں خوشی کی ایک محسوس کی جانے والی کھنک تھی۔

باتوں سے نہیں چل سکتی۔“ شامکہ اس کی باتوں سے لگاؤ محسوس کرتے اترانے لگتی تھی۔
”اس لیے تو جاگ رہے ہیں، اپنی دنیا بھی تو بنانی ہے۔“ وہ مدھم سا ہنسا۔

”باہر ایک رات طاری ہے، اور رات کا ہمسفر چاند..... دونوں ایک دوسرے کے بغیر کتنے نامکمل لگتے ہیں۔“ شامکہ نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر چھانکا۔ رات کی رانی کی خوشبو کھڑکی سے اندر آگئی تھی۔ ایک گہری سانس لی..... محبت کی خوشبو اندر اُتری۔

”رات کو یہ چاند کتنا عزیز ہوگا۔“
”باوجود اس کے، کہ وہ رات کی سیاہی کو کم کر دیتا ہے۔“
”مانو جیسے رات کا اندھیرا مسکرا اُٹھا ہو۔“
”چاند کو رات کا وجود رکھتا ہے، اس کا سارا حسن اسی میں پنہاں ہے۔“

”چاند خوش قسمت ہے یا رات؟“
”وہ بندھن، وہ تعلق جس کے گرد یہ دونوں جڑے ہیں۔“
”یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے اچھے لگتے ہیں جیسے.....“
”جیسے.....؟“

”جیسے کہ.....“ وہ کچھ کھوجتے کھوجتے کھو گئی۔
اپنے احساسات کو زبان دینے کے لیے اسے الفاظ نہ میسر آئے۔

”جیسے کہ ہم دونوں..... شامکہ اور خضر..... ایک رائٹر اور ایک قاری..... ایک قلم اور دو کردار، ایک کہانی..... دو دل اور ایک احساس..... ہم دونوں، ایک ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔“ خضر نے تمام جذبات ایک لڑی میں پرو دیے تھے۔ شامکہ مبہوت سی کھڑی رہ گئی تھی۔

”جیسے رات اور چاند نہیں..... یہ دونوں ایک ہو کر بھی اجنبی سے ہیں۔ جیسے چاند اور چاندنی..... ایک ہوا تو دوسرا لازمی۔“

”آپ مجھے ایک بار ہی بتا دیں کہ کتنے سر پرانز میرے لیے منتظر ہیں۔“ وہ ہنسی کے دوران بولی۔ لب کھلے کھلے سے رہے۔

”اؤں..... یہ تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ زندگی میں ایسے بے شمار موقع آئیں گے جو.....“
خضر نے بات ادھوری چھوڑی جیسے وہ کچھ سوچتے ہوئے زندگی کی شاہراہ کو نگاہ کی آخری حد سے دیکھ رہا ہو۔ شامکہ کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”بہر حال..... میں آپ کو اس کا ریٹرن ضرور دوں گی۔“ اس نے خاموشی توڑنے کے لیے بات بتائی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے آپ کا فیور چاہیے ہوگا۔“ خضر نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔ شامکہ چونکی۔
”کیسا فیور؟“

”وہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔“
”آپ..... آپ آج کل بہت پہیلیاں بھجوانے لگے ہیں۔“ شامکہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔

”جی! یہی کام آپ اپنی کہانیوں میں کرتی رہتی ہیں۔“ خضر نے یاد دلایا۔
”ایک رائٹر کو کہانیوں میں کچھ بھی کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔“ شامکہ فخریہ بولی۔

”اور ایک قاری کو اپنی رائٹر سے کچھ بھی سیکھنے کی.....“ خضر کی برجستگی پر دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

”ٹھیک جارہے ہیں۔ اچھی باتیں بنانی آگئی ہیں۔“ شامکہ نے کریڈٹ لیا۔

”یہ آپ ہی کا کمال ہے، ورنہ میں اتنا باتونی تو نہیں ہوں..... آپ سے بات کرتے ہوئے دل چاہتا ہے وہ بھی موضوع ڈسکس کیا جائے جو ہم محفل میں نہیں کرتے۔ نہ باتیں ختم ہوں نہ رابطہ منقطع.....“

”آپ جاگ جائیں یہ دنیا ہے، دنیا صرف

سے بات کرنا ایک خواب تھا، مجھے بھی نہیں علم تھا کہ یہ خواب اتنے سارے یقین اکٹھے کر لے گا۔“ خضر کا لہجہ بہت نرم اور جذبات سے لبریز تھا۔ شامکہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوئی.....

”آپ مجھے مغرور کر رہے ہیں۔ دیکھ لیں آگے آپ کو ہی مشکل ہوگی۔“ متبسم لہجہ اور چھیڑنے جیسا انداز۔

”مجھے ہر مشکلات قبول ہیں..... میں کوشش کروں گا اسے جلد آسانیوں میں بدل دوں۔ آپ میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔“ شامکہ بے ساختہ سرشار ہو کر مکھلائی چلی گئی تھی۔ اور یہ ہنسی ایسی تھی جیسے اس کی بات پر پھولوں کی برسات کر دی ہو.....!

☆☆☆

صبا اندر داخل ہو رہی تھی، تاجور کا طیش گہرا کرنے کے لیے.....

”تمہیں کیا اتنی تمیز نہیں ہے کہ جب دو لوگ آپس میں بات کر رہے ہوں تو کمرے میں بغیر اجازت نہیں آنا چاہیے۔“ وہ بغیر کوئی لحاظ رکھے سلگتے لہجے میں بولی تھی۔ صبا پر جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ وہ گہری نظروں سے دونوں کا جائزہ لے رہی تھی..... حاکم جانتا تھا کہ تاجور کسی صورت چپ نہیں ہونا چاہتی۔ اس کے اندر بیزاری بھرنا شروع ہو چکی تھی۔

”جب دو لوگ آپس کی بات کر رہے ہوں تو یقیناً یہی اصول لاگو ہوتا ہے، لیکن یہاں میرا ذکر ہو رہا ہے..... میری ذات زیر بحث لانی جا رہی ہے۔ تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آپ ہم لوگوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے تو نہ جھگڑیں۔“ وہ کچھ تشویش، کچھ فکر مندی آنکھوں میں بھر کر گزارش کر رہی تھی۔ تاجور کا غصہ دوچند ہوا۔

”میں تم لوگوں کو اس قابل نہیں جانتی کہ اپنا وقت تم پر برباد کروں۔ جس معاملے سے تم بے خبر ہو اس سے دور رہو۔ جاؤ یہاں سے.....“

”کیا میں بھی آپ کے لیے لازم سا ہوں؟“ خضر نے کچھ شرارت سے، کچھ دل کی ضد سے پوچھا۔

”یہ تو آپ فیور مانگیں گے تو جب ہی بتاؤں گی۔“ شامکہ نے دل کی خوشی چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ دونوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے تھے۔

”چالاک رائٹر.....!“ خضر نے بہت سکون سے، کسی بھی بوجھ سے آزاد ہو کر، بلا تردد خطاب دیا۔ ”ایک رائٹر سے..... راز کی باتیں بھی نہیں پوچھنی چاہئیں۔“ شامکہ نے وارن کیا۔

”کیونکہ ان کے جواب ان کے لفظوں کے الجھاؤ میں ہی چھپے ہوتے ہیں۔“ خضر نے یقین سے کہا۔

”خیال کیجیے گا، وہ الجھاؤ بوجھنے کے چکر میں کہیں غلط اندازے نہ لگا بیٹھیں۔“ شریر سی مسکان لبوں پر کھیل رہی تھی۔

”یہ آپ کی کہانی کے راز نہیں، میرے دل کے ساز ہیں، جو صرف انہی سنکٹوں پر بجتے ہیں جب کچھ سچ میں واقع ہو رہا ہو۔“

”شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں، ایسے لگتا ہے میں ابھی تک کسی خواب کے سفر میں ہوں..... میرے ساتھ وہ ہوا جو اس سے پہلے بھی میرے گمان میں نہیں تھا۔ اس دنیا میں، مثل بہشت میں کوئی خضر بھی ہوگا..... جو اس طرح میری زندگی میں شامل ہو جائے گا۔ میرے وقت میں، میرے خیالوں میں، میری تخلیقی خاموش دنیا میں.....“

اُس کی آواز کے اتار چڑھاؤ بے یقینی کا غماز تھے۔ محبت اسی طرح بار بار بے یقین کر دیتی ہے۔ انسان بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے، اُس مرکز کو، اُس نقطے کو جہاں سے شروع ہوئی تھی، اور دل میں سرایت کرتی گئی تھی۔ ایک خوش کن سفر اور بے یقینی کا مسکور کردینے والا احساس.....

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا سوچا، میرے لیے تو آپ

جاتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں اس کے دوسرے نکاح کو جس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس سے تو کم از کم بہتر تھا۔“ وہ آخر میں آبدیدہ سی ہو گئی تھی۔ تاجور ذرا بھر متاثر نہیں ہو سکی۔

”اور طلاق سے پہلے؟“ تاجور نے طنزیہ مسکراہٹ سے اس کے چہرے کی پرت ہٹائی۔ صبا کا رنگ ایک لمحے کے لیے بدل سا گیا۔

”میری سب سے بڑی سچائی یہی ہے کہ میں صدام کی بیوی ہوں۔ تم اس وقت بہت رخ ہو رہی ہو، تمہیں احساس نہیں کہ میں تمہاری جھٹائی ہوں..... رہتے میں تم سے بڑی۔ بخداور کے ساتھ تو تم ایسی نہیں تھیں تاجور۔“ صبا نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ دل ہی دل میں وہ کئی باتیں بیک وقت سوچ رہی تھی۔ مگر نظریں تاجور پر مرکوز تھیں۔

”اُس کا نام بھی مت لو تم۔“ ایک زخمی سی احساس تاجور کے چہرے پر ابھرا۔

”وہ تم جیسی نہیں تھی..... تم چاہ کر بھی اُس جیسی نہیں ہو سکتیں۔ اور میری بات کرہ سے باندھ لو۔ میری تم سے دیورانی، جھٹائی والی کوئی چیقلش نہیں ہے، میں تم سے ایسا کوئی رشتہ رکھنا ہی پسند نہیں کرتی۔ تمہارے لیے اچھا ہے کہ میرے کاموں میں دخل مت دو..... جو تمہیں یہاں لایا ہے، صرف اسی پر اپنا حق جتاؤ۔“ تاجور نے بات ختم کر کے منہ موڑ لیا۔ صبا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ دل میں کوئی ایال سا اٹھا تھا، مگر یہ غبار وہ نکالنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

”میرے بارے میں تمہاری رائے کتنی غلط ہے تاجور..... مجھے لگا تم اچھی سوچ کی مالک ہو گی۔“ وہ جیسے مایوسی و افسوس سے سر ہلانے لگی۔ تاجور کے لیے وہ کسی امتحان سے کم نہیں تھی، جو سامنے کھڑی تھی اور ہٹ نہیں رہی تھی۔

”میں اچھی سوچ کی مالک کیسے ہو سکتی ہوں۔ تمہارے شوہر نے تمہیں بتایا تو ہو گا کہ اس کے گھر کی عورتیں کیسی ہیں..... ورنہ وہ انہیں بھٹی میں جھونک کر تم جیسوں پر کیوں متوجہ ہوتا۔“

”بھلا کوئی ایسا معاملہ بھی ہے جس سے میں بے خبر ہوں؟“ صبا کا انداز عام سا تھا، مگر آنکھوں کے تاثرات صاف تاجور کا تمسخر اڑاتے ہوئے..... تاجور نے تلخ گھونٹ بھرا۔

”دیکھیں، آپ نے میرے کردار پر بات کی۔ مجھے برا بھلا کہا، مجھے ناراض ہونا چاہیے مگر میں کچھ نہیں کہہ رہی۔ میں صرف.....“

”تم میری بات سنو!“ تاجور نے ہاتھ اٹھا کر بہت ضبط سے اسے روکا۔

”اس سارے واقعے میں تمہارا اہم کردار رہا ہے، تم پر بات کرنا بیکار تھا کہ تم نظروں سے اوجھل رہیں..... لیکن اس سارے فساد کی جڑ تو تم ہی ہو۔ تم جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو خاندان کے خاندان تباہ کر دیتی ہیں۔ اور کیا کہنا چاہیے تمہیں ہاں؟ کہنے کے قابل ہی کیا ہو تم..... وہ جو اپنے گھر کی نہ ہو سکی تو کسی کے شوہر کو اس کی موت پر ہی بھانس لیا۔ اب کہو تم کہ تم پہلے سے شادی شدہ نہیں تھیں؟“ تاجور کی آنکھوں سے ہی نہیں لفظوں سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر ہی پہچان چکی تھی۔

”ہاں میں شادی شدہ تھی۔“ صبا نے تحمل سے جواب دیا۔ حاکم کے دل میں برچھی گڑ گئی۔ اور ابھی تک یقین و بے یقینی کے درمیان جھول رہا تھا..... صدام کا کہا سچا تھا، یا تاجور کی کہی باتیں؟ وہ صدام کا سچ چاہتا تھا۔

”تو تم مجھے کہو گی کہ اپنے کردار پر تم ابھی بولنے کے قابل ہو۔ بولنا وہاں ضروری ہوتا ہے جہاں کوئی آپ کے جھوٹ بے یقین کرے۔ تم کس ڈھٹائی سے ابھی اپنی صفائی پیش کرو گی۔“ تاجور بھول چکی تھی کہ وہ کسی اجنبی سے مخاطب ہے۔ اُس کے اندر جلتے بھانپڑے آج خشک یا سبز کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھے۔

”میں اپنی کوئی صفائی پیش کرنے نہیں آئی، میں تو صرف بات کو رفع دفع کرنے آئی ہوں۔ ہاں میں شادی شدہ تھی تاجور! مگر کیا طلاق کے بعد عورت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے؟ طلاق کے بعد عورت مر

ہی گھر کے لوگوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ”وہ دل ہی دل میں زور سے ہنسی۔ پھر کسی خیال کے تحت وہ ہنسی چھپاتی ہوئی تاجور کی جانب بڑھنے لگی۔

تاجور کو احساس نہیں تھا کہ اپنے غصے اور جذباتی پن میں اُس نے اپنا ایک دشمن پیدا کر لیا ہے۔

”بہت بڑھ چڑھ کر بول گئی ہو تم، اتنا بھی خیال نہیں رکھا کہ زبان دوسرے کے پاس بھی ہے۔“ وہ اس کی پشت پر کھڑے ہو کر سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ تاجور جواب دینے کی زحمت کیے بغیر مرغیوں کو دانہ ڈالتی رہی۔

”میں صرف حاکم کا لحاظ کر کے چپ تھی، ورنہ یہ نہ سمجھنا کہ میرے پاس تمہارے منہ توڑ جواب نہیں ہیں۔“ اس کی بے نیازی اسے سلگا گئی تھی۔ تاجور اپنی کامیابی پر مڑی۔

”کاش! تم نے یہ کہا ہوتا کہ تم نے میرا لحاظ کیا ہے تو شاید میں تمہارے بارے میں اپنی رائے تھوڑی سی بدل لیتی۔ مگر تم تو وہی ہونا، مردوں کی نظروں میں عظیم بننے کے سارے گروں سے واقف.....“

”ہا ہا.....“ وہ لطف لے کر ہنسی۔ ”تمہیں لگتا ہے میں بھڑک جاؤں گی تو تم غلط ہو۔ میں یہاں راج کرنے آئی ہوں، تمہیں مجھے برداشت کرنا ہے..... مجھے تمہیں نہیں۔“

”کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ جلد دور ہو جائے گی۔“ تاجور نے اسے آگاہ کیا۔ وہ بھی اس کی رعب میں آنے والی نہیں تھی۔

”صدام مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا کر لایا تھا۔ مگر تم تو اُس سے زیادہ بری ہو۔ مولوی صاحب کی تاجور اور.....“ محظوظ ہونے والے انداز میں اس نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔ تاجور اپنی جگہ سے اٹھی۔

”اس سے زیادہ بری؟ میں تمہاری سوچ سے زیادہ بری ہوں۔“ تاجور کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ ایسا کہ جسے بھانپ کر صبا کی مسکراہٹ سمٹی۔

”مگر کیا تم مجھے جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟“

”تاجور! اب بس کردو۔“ درد سے پھٹتے سر کو انگلیوں سے دباتے حاکم کی اب کی پارختی سے سرزنش کی۔ حالات نے تاجور کو کس قدر تلخ کر دیا تھا۔ وہ ”وہ“ رہ ہی نہیں گئی تھی جو وہ تھی۔

”حاکم بھائی! یہ تو مجھ سے بہت بدگمان ہے۔ نکاح کر کے شاید ہم نے کوئی گناہ کیا ہے شاید..... کم از کم آپ اپنے بھائی پر یقین کریں۔ اس کی اجازت تو ہمارا دین دیتا ہے۔ اور اس صورت میں تو، جب میں بے سہارا تھی، میرے پاس سر چھپانے کو چھت نہیں تھی.....“

”یقین.....“ حاکم سے پہلے تاجور کی کھوکھلی ہنسی گونجی۔

”ہم کیوں یقین کریں۔ اس پر یقین جس بندے نے ہزاروں جھوٹ بولے جب اس کی سچائی سامنے آ گئی تھی..... تاجور جان چکی ہے تم لوگوں کو، حاکم کی اپنی مرضی ہے میں بھی مر کر بھی اس پر یقین نہ کروں۔“

”تاجور! میں نے کہا بات کو ختم کرو۔“ حاکم نے بہت غصے سے کہا۔ کچھ لمحے مزید گزرتے تو شاید وہ پھٹ پڑتا۔

”سب ختم ہی ہو گیا ہے۔ کچھ باقی نہیں رہا۔ آپ میرے لیے بھی اچھے ثابت نہیں ہو سکتے، اس پر آپ نے آج مہر ثبت کر دی ہے..... اس گھر میں تھوڑی سی اچھائی کی اُمید میری سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔ اسے فیصلوں میں اب میں بھی آزاد ہوں.....!“ دو ٹوک انداز میں کہتی ہوئی وہ باہر نکلی۔

”تاجور.....“ حاکم نے اسے آواز دی۔ مگر پہلی بار وہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔ حاکم غصے میں پاؤں پٹختا قدموں کی دھمک پیدا کرتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے صبا خان..... وہ سکون سے سینے پر ہاتھ لپیٹے کھڑی تھی۔

”لوجی! صحیح کہتا تھا وہ ہتھ چھٹ آوارہ نشی (سیاقہ شوہر) جس گھر میں قدم رکھیں نحوست چھا جاتی ہے۔ میں تو اپنا گھر بنانے آئی تھی، یہاں پہلے

دیکھ، بڑی تعداد میں گولیاں پڑی ہیں۔ کوئی کھا لوں گا تو آرام آئے گا۔ شام میں جا کر حکیم کو..... وہ بولتے بولتے ہانپ گیا اور کھانسنے لگا۔ چندا گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”نہیں نہیں! یہ خطرناک ہوتا ہے نجانے کتنی پرانی گولیاں پڑی ہیں۔ اسی لیے تو ہر وقت بیمار پڑا رہتا ہے یہ گولیاں پھونک پھونک کر.....“

”جھلی! زہر ہی زہر کا توڑ کرتا ہے۔ یہ تو سن رکھا ہوگا.....“ وہ نقاہت سے ہنسا۔

”رہنے دے چچا۔ ہر جگہ ایک ہی اصول لاگو نہیں ہو سکتا۔“ وہ اکتا کر کسی دلچسپ منظر کی تلاش میں نظریں گھمانے لگی۔

”میرا اندر بہت جل رہا ہے چندا۔“ وہ چند لمحے بعد کراہا کر بولا۔

”تیرا باہر بھی بہت جل رہا ہے چچا۔“ چندا کو زور سے ہنسی آئی مگر دبا کر بولی تھی۔

”ویسے تیرے پاس کچھ پیسے ہیں، سو جی منگوا لیتی ہوں، حلوہ بنانے کا بڑا دل کر رہا ہے..... تجھے بھی تو کچھ کھانا ہوگا نا۔“ وہ منہ پر مسکینیت طاری کرتی ہوئی لگاوٹ سے بولی۔ کرم الہی نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے گھورا۔

”بڑی چالاک ہے تو، دل تیرا کر رہا ہے احسان مجھ پر..... منگوالے منزل سے، ساری دکان ہی تیری ہے جب۔“

”نہیں نا، تجھے تو پتا ہے منزل کتنا کنجوس ہے۔ پھر نئی دکان ہے بے چارے کی..... تیری بات تو اور ہے نا، تو نے کون سا اپنے بچے پالنے ہیں۔“ وہ بے فکری سے بول رہی تھی۔ کرم الہی اس کا لالچ چہرے نظر آنے لگتا تھا۔ کرم الہی بڑبڑاتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔

”آئے دن تمہاری زبان کا چسکہ، مجھے وقت سے پہلے بھکاری بنا دے گا۔“

”دل بڑا کر چچا، تیرا بیاہ میں نے ہی کرانا ہے..... اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔“ وہ نوٹ پکڑتے

صبا کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ رہی تھیں۔

”یہ سوال میں تم سے کرتی ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ تم کون ہو؟ تمہارے جیسی عورت کو زمانہ کس آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہ مجھ سے زیادہ تمہیں جاننے کی ضرورت ہے۔“ بڑی دل جلانے والی مسکراہٹ تھی تاجور کی۔ ٹھیک کہا تھا اس نے کہ صبا اس کے کاموں میں داخل نہ دے..... اسے لگا تاجور نے لفظوں سے تھپڑ مار دیا ہے اسے۔ وہ ایک سے دوسری نگاہ ڈالے بغیر وہاں سے چلی گئی..... مگر صبا خان کی آنکھوں میں کوئی تحریر لکھی جا رہی تھی۔

جو کچھ وہ حاکم اور تاجور کے درمیان دیکھ چکی تھی، اسے تاجور پر اُلٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ تاجور کو انجانے میں بھی صبا کے منہ نہیں لگنا چاہیے تھا۔ آنکھوں میں لکھی تحریر واضح ہوتی گئی۔

خالم ”جھٹانی“ کیا ہوتی ہے؟ تاجور نے بختاور کو برتا تھا..... یہ اب اسے صبا خان بتانے جا رہی تھی۔

صبا خان! جو بختاور کبھی نہیں ہو سکتی تھی!

☆☆☆

کرم الہی کی طبیعت ناساز تھی۔ چندا کئی بار آ کر پیشانی کو انگلیوں سے چھو چکی تھی، مگر حرارت میں کچھ تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔

”تجھ پر تو پٹیوں کا اثر بھی نہیں ہو رہا چچا..... تو تو مر جائے گا اس طرح۔“ وہ فکر مندی سے ناخن دانت میں دے کر کہنے لگی۔ کرم الہی نے اپنی سرخ پڑتی آنکھیں واکیں۔

”یہاں تو سب چاہتے یہی ہیں کہ میں مرجاؤں..... کاٹنا ہوں ناسب کی آنکھوں کا، مگر کسی کی یہ خواہش آسانی سے پوری نہیں ہوگی۔“

”ہائے کیسی باتیں کرتے ہو چچا! تمہارے سوا ہمارا کون ہے بھلا..... منزل بھی دکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ کہہ کر بھیجا تھا کہ کوئی گولی بیچ دے، بخار دماغ پر نہ چڑھ جائے۔“ پھر سے دل میں خدشہ جاگا۔

”اُوئے، میرے دوائی کے شاہر میں جا کر

ہوئے ادا میں دکھانے لگی۔ کرم الہی کسی خیال کے تحت چوڑا۔

”جانتی ہو چندا! میری حالت ہمیشہ ایسی تب ہوئی جب کسی نے میرے کھانے میں جان بوجھ کر کچھ ملایا۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب کر بولا تھا۔ چندا چیخ پڑی۔

”تیرا کھانا میں بناتی ہوں کرم الہی..... تجھے لگتا ہے کہ میں نے.....“ وہ بے حد برامان گئی تھی۔ ”اُدھیں۔ میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی تو آیا ہوگا.....؟“ وہ اب پوری طرح نفیث کے موڈ میں تھا۔

”ہاں ٹو بادشاہ ہے نا کسی ریاست کا۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”جتنا پوچھا ہے اتنا بتا.....“ وہ بھی جھنجھلا گیا تھا۔

”ساتھ والی بلیتیس آئی تھی، اپنے ابا کے حق کے تمباکو پرانگارہ رکھنے..... ایسے کنگے ہیں ماچس کی تیلی ضائع کیوں کریں۔“ چندا یہاں رہ کر خود کو کوئی چیز سمجھنے لگ گئی تھی۔

”بس پھر یہ تو ایک بہانہ تھا۔“ کرم الہی بھرپور یقین کے ساتھ بولا۔ ”وہ تیری آنکھوں میں اور میری ہانڈی میں کچھ جھونک گئی ہے..... میں ایسے ہی بیمار نہیں پڑتا۔“

”پر وہ ایسا کیوں کرے گی؟“ ناچاہتے ہوئے بھی کرم الہی کا گہرا یقین دیکھ کر چندا حیرانی سے گویا ہوئی۔

”کیونکہ میں نے اس کی بیوہ دادی کا رشتہ ڈالا تھا اپنے لیے، دو کنال زمین کے ساتھ..... تب سے یہ لوگ میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔“ کرم الہی نے بلا خرمجیدگی سے انکشاف کر دیا۔ اور چند لمحے بات سمجھنے میں ضائع کرنے کے بعد چندا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”ہا ہا ہا اس کی دادی کا رشتہ.....“ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی بمشکل بول پائی۔ ”تو بھی کمال کرتا

ہے چچا..... اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں تجھ جیسا بندہ۔“

”ہوں! نکالتی جا دانت، میرے دشمن کام کر گئے اور تجھے محول سوچہ رہے ہیں۔“ وہ ناگواری سے منہ موڑ کر بڑبڑانے لگا۔ چندا ہمدردی سے اُس کے قریب آئی۔

”تو فکر ہی کیوں کرتا ہے۔ چندا تیرے ساتھ ہے پھر کیا ڈر کی بات ہے..... سب کو میں آپ ہی دیکھ لوں گی اور تیرا ویاہ بھی سارا بند دیکھے گا۔“ وہ فخر سے اس کے شانے تھپتھپانے لگی۔ کرم الہی کے چہرے پر خفگی کے آثار رہے مگر خطوط ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اسی وقت کوئی صحن میں داخل ہوا تو کرم الہی کی نظر اس پر پڑی۔

”اُوئے بسم اللہ! بگو آیا ہے۔ آ جا آ جا شاباش..... آج کیسے راستہ بھول گیا.....“ کرم الہی سیسی کے ابا کو دیکھتے ہی کھل اُٹھا۔ وہ ہمیشہ ان کی پزیرائی اسی طرح کرتا تھا۔ چندا جو ہلکی سی جھکی ہوئی تھی، اس اجنبی کو دیکھ کر سیدھی ہوئی اور شانے سے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ جو قدم قدم اُٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے..... چندا پر نظر پڑی تو آنکھوں میں کوئی ناپسندیدہ سا تاثر اُبھرا۔ چندا ٹھٹھکی سی گئی۔

”آ جا یہاں بیٹھ! بڑی ٹھنڈی سی دھوپ نکلی ہے۔ چندا جا شاباش بگو کے لیے چاء کا انتظام کر۔“ (بگو پیار سے کسی خوب صورت انسان کو پکارتے ہیں) کرم الہی نے مڑ کر چندا کو حکم دیا جو برا منہ بنائے کھڑی تھی۔ ایک نظر ڈالنے کے بعد اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ابا چار پائی کے کونے پر بیٹھ چکے تھے۔

”اس کی ضرورت نہیں چچا! میں تو تیرا حال چال پوچھنے آیا ہوں۔“ انہوں نے سہولت سے انکار کر دیا۔

چندا ”ہونہہ“ کرتی ہوئی تندور پر چڑھی اور دیوار کو دکر اپنے گھر اتر گئی۔

”یہ بھی اچھی کہی، مہینوں بعد شکل دکھانے آ گیا۔ کسی دن اعلان سنتا کرم الہی کے مرنے کا اور

بخار ہو رہا ہے کیا؟“ وہ فکر مندی سے بولے اور کلائی چیک کی۔

”رہنے دے پار! یہ تو آئے روز کا عذاب ہے..... بڑھاپے کا روگ۔“ وہ بہت بے زار لگ رہا تھا، تب ہی بول گیا..... ورنہ اس کی زبان سے لفظ ”بڑھاپے“ بہت کم سنا جاتا تھا۔

”پہلے بتانا چاہیے تھا تجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔ خیال نہیں رکھنا اپنا۔“ اُس کا بدن بری طرح تپ رہا تھا۔ محسوس کر کے ہی انہیں تشویش ہوئی۔

”اس عمر میں کہاں سکتا ہوتا ہے اپنا خیال رکھنے کی، اللہ نے نہ اولاد دی اور نہ خیال رکھنے والی..... جو بھی وہ تو وقت سے پہلے ہی.....“

”اتنا نہ سوچا کر.....“ اُس کی محرومی محسوس کر کے وہ نظریں چراگئے تھے۔ دل میں افسوس سا ہوا تھا۔ کرم الہی مسکرانے لگا۔

”اب کیوں دل برا کرتا ہے۔ کہا تو تجھے بھی تھا کہ میری تنہائی کا خیال کر لے، تیری دھی بھی خوش رہتی زمین پیسہ.....“

”چچا.....“ ابا نے بہت تحمل سے اسے ٹوکا۔ چند لمحے پہلے والی کیفیت کا اثر تھا ورنہ پہلی بار کرم الہی کی ایسی بے تکلی بات کا بہت ناگواری سے جواب دیا تھا۔

”ہاں بس بس زیادہ زنانیوں کی طرح کڑوے منہ نہ بنا..... صرف بات کر رہا ہوں، متیں کرنے والا میں بھی نہیں۔“ کرم الہی کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

”کتنی بار تجھے کہا ہے کہ ہر بات کرنے والی نہیں ہوتی۔ کب خیال کرے گا تو.....“ وہ قدرے نرمی سے بولے۔ شاید پہلے شخص تھے وہ جو کرم الہی کی گڈ بک میں تھے۔ کرم الہی ان کی کوئی بھی بات سن لیتا تھا۔

”ہمدردی کی بیماری بھی تو تجھے لاحق ہو رہی ہے۔ چل ہٹ پرے، مجھے جھوٹی فکر نہیں چاہیے۔“

وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔

پھر افسوس کرتا کہ کئی دنوں سے خیریت پوچھنے کا سوچ رہا تھا بس قسمت نے موقع نہ دیا.....، کرم الہی انتہائی جذباتی ہو کر بولا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس طرح کی باتیں کیوں کرتا ہے، تو تو ابھی نو جوانوں سے زیادہ طاقت ور اور تندرست ہے۔“

”یہ بات تو غلط نہیں ہے مگر عزیزوں کا بھی کوئی حق بنتا ہے کہ نہیں؟“

”بس چچا، کیا بتاؤں۔ وقت ہی ایسا آ گیا ہے کہ انسان کو اپنے لیے وقت نکالنا بھی میسر نہیں..... ذمہ داریاں اتنی ہے سر پر، روز سوچتا تھا آج عمل کرنے کا موقع ملا۔“ وہ اس کے شکووں پر گہری سانس بھر کر گویا ہوئے۔ کرم الہی نے ناراضی چھوڑ کر اثبات میں سر ہلایا۔ بھلے وہ اس بات سے متفق نہ تھا۔

”چل تیری مہربانی۔ یہ بتا تیرے لڑکے کا کام کیسا چل رہا ہے؟“

”ابھی کوئی کچی جگہ کام تو نہیں لگا مگر اللہ کا شکر ہے کہ کسی نہ کسی جگہ کام مل ہی جاتا ہے۔ کہہ رہا تھا جلدی کسی جگہ کام بن جائے گا تو پھر مشکل آسان ہوگی۔ بیٹی کا فرض ادا کر رہا ہوں..... اللہ کے حکم سے سارے کام بہترین ہو جائیں گے۔“

”ماشاء اللہ! بس دعا کیا کر..... باہر جا کر بھی پیسے ٹاپلی کے پیڑ پر تو اُگتے کہ توڑتے جاؤ، آہستہ آہستہ قدم جمالے گا۔“ کرم الہی نے سنجیدگی سے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

”ان شاء اللہ! تیری بھی مہربانی چچا تو نے ہماری مدد کی، ورنہ اتنا پیسہ میرے پاس تو جمع نہ تھا..... مظفر جلد تیرا احسان اُتارے گا۔“

”احسان کیسا، میرا اپنا بچہ ہے..... تو مجھ سے غیروں والی باتیں نہ کیا کر۔“ اس نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کی ہتھیلی پر رکھا تو ابا بری طرح چونکے۔

”ارے، تجھے تو بہت حرارت ہے، پھر سے

”تو میں کر رہا ہوں نا تیری خدمت..... اٹھو ڈاکٹر سے دوائی لے کر آتے ہیں۔ کسی دن ہسپتال کیوں نہیں جاتا، صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔“ وہ سہارا دے کر اٹھانے لگے۔ کرم الہی راضی نہیں تھا۔

”میں کہیں نہیں جا رہا۔ ہسپتال کی دوائی میں تو پانی زیادہ بھرا ہوتا ہے خاک اثر نہیں ہوتا۔ میرے تو یہ روز کے روگ ہیں..... خود ہی جان چھوڑ جائے گا ایک دن۔“

”رات کو تکلیف بڑھ جائے گی۔ چچا، ضد نہ کر، میں آ ہی گیا ہوں تو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ خود چل کر خبر لیتا ہوں حکیم کی، ہمت کر.....“ وہ انہیں سہارا دے کر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کرم الہی کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ اُسے واقعی اس وقت دیکھ بھال کی اشد ضرورت تھی۔

☆☆☆

حاکم کے چہار سو ایک خاموشی لیٹ گئی جو عجیب سا شور کرتی تھی۔ صدام کو اپنی زندگی کی پروا تھی، اسے اپنا حق یاد تھا۔ تاجور کو اپنی زیادتیوں نے نڈھال کر دیا، جبکہ وہ..... اس کا مان ٹوٹا تھا، گہرا یقین..... کوئی ٹھوس چیز، جو بری طرح ٹوٹ کر صرف ریزہ ریزہ نہیں ہونی بلکہ بہت اندر تک گھائل کرتی چلی جاتی ہے۔

وہ ہر ایک سے لڑ سکتا تھا، اندھا یقین رکھ سکتا تھا صدام پر، مگر آج تو خود اُس کا یقین اندھا ہو گیا تھا جب کئی آنکھوں نے وہ منظر جذب کر لیے جو پہلے کانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتے آئے تھے۔ اب کوئی اسے سنانے والا نہیں تھا، کسی نے نہیں دیکھا کہ حاکم کا یقین کھوٹا ثابت ہو گیا..... وہ کسی کے سامنے جواب دہ تو نہیں تھا؟ ہاں سوائے خود کے.....

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھرم قائم کر لے۔ صدام پر ایک بار پھر یقین..... آخر حرج ہی کیا تھی؟

وہ بات ایسی تو نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کرنا چھوڑ دے، لیکن اس کے باوجود..... کچھ تو تھا جو دل میں چبھتا تھا اور تاجور کی آواز کی بازگشت، تھوڑے کی صورت دماغ میں برستی تھی۔

مولوی حیات کے آنسو، تاجور کی برداشت.....

مولوی حیات کی وفات حاکم کا بے رحمانہ پن.....

ایک ایک منظر ترتیب سے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا۔ زندگی میں بے سکونی پہلے ہی کم تو نہیں تھی کہ مزید اضافہ ہونے چلی آئی۔ وہ مردہ قدموں کو گھسینا باہر آیا۔

وہ باہر آ کر چار پانی پر اوندھے منہ گر گیا۔

وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنا سامنا بھی نہیں کرنا تھا..... بہت مشکل تھا اپنے اندر جھانکنا۔ وہ خود سے بھی بیزار ہو چکا تھا۔ ہا! لیکن اس کی فطرت!

☆☆☆

صدام آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا ہوا تھا۔ ”صدام۔“

”ہوں۔“ اس کی آواز نیند سے بوجھل تھی۔ رات بھر جاگنے کی غماز..... صبا کو آتایا کر بازو ہٹا لیا۔ ”تھوڑی دیر میں چلتے ہیں واپس..... آنکھ لگ گئی تھی۔“ وہ صبا کی اس آجیبی ماحول میں بے چینی ہونے کا سوچ کر بولا۔ صبا اس کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک ادا سے مسکرائی۔

”تم سے کس نے کہا میں واپس جانے کے لیے آئی ہوں؟“

”واپس تو جانا ہے، ہمارا ٹھکانا کوئی اور ہے۔“ وہ اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

”لیکن یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ بلکہ تم ہی بڑے ہو اس گھر کے..... اس لحاظ سے تو میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔“

”مجھے احساس ہے کہ یہاں کا ماحول سازگار

”کیوں کیا میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی؟“ صبا
 اُلٹا سوال کرنے لگی۔
 ”سوال یہ نہیں ہے، اس گھر میں ایسا کیا ہے کہ
 تم اچانک یہاں رہنے کی خواہش ظاہر کرو؟“
 ”یہی کہ اسے ہم ”گھر“ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں
 تمہارے سارے رشتے دار ہیں تمہاری بہنیں آتی
 ہیں، تمہاری ماں ہیں۔ وہاں تو میں اکیلی رہتی ہوں،
 بس اس لیے میں یہی رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ کچھ
 لاڈ سے، کچھ ضد سے منوانے لگی۔ صدام کو اس کی ہر
 ادبھاتی تھی۔
 ”وہاں تم اکیلی کہاں رہتی ہو، کیا وہاں میں
 نہیں ہوتا؟“ وہ معنی خیز لہجے میں کچھ جتا گیا۔ صبا کی
 سوتی کہیں اور اٹکی تھی۔
 ”تم تو یہاں بھی ہو گے نا۔ بس سمجھو یہی میری
 خواہش ہے۔“ اس کی ضد پر زور تھی۔
 ”تم تو کہتی تھیں تمہیں صرف مجھ سے مطلب
 ہے، ایک رات سسرال میں گزارتے ہی دل بانٹ
 لیا تم نے۔“ وہ شرارتی انداز میں چھیڑنے لگا
 صبا کھلکھلائی۔
 ”تم سے ہی مطلب ہے۔ باقیوں کو اپنانے
 میں تو وقت لگے گا۔“
 ”تمہاری یہی خوشی ہے تو یہیں رہو..... ہمیں
 اپنی آنکھوں کے سامنے خوش دیکھے تاجور تا کہ اپنی ہی
 لگائی آگ میں خود جلتی رہے۔“ صدام نے نفرت
 سے اس کا ذکر کیا تھا۔ صبا کو خوشی ہوئی۔ پورے اعتماد
 کے ساتھ وہ اٹھی اور دن کے اجالے میں آگئی۔ اس
 کے تصور میں تاجور تھی۔
 ”کام شروع ہوتا ہے اب..... اور میرا انتظار
 بھی۔“ وہ خود سے مخاطب ہوئی۔ جو کچھ وہ حاکم اور
 تاجور کے درمیان دیکھ آئی تھی وہ رائیگاں نہیں جاسکتا
 تھا۔ تاجور کی آنکھوں میں جو کچھ لپکتی اسے نظر آئی وہ
 اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں سوائے بغاوت
 کے..... پہاڑ میں دبا کوئی لاوا، کوئی سرکشی کی لہر۔ اس
 غلطی نہیں ہوئی وہ بھانپ چکی تھی۔

نہیں ہے..... میں نے اس طرح سے نہیں چاہا تھا،
 مجھے پہلے سے کچھ سوچ لینا چاہیے تھا۔“ صدام کا لہجہ
 نہایت معذرت خواہانہ تھا، جبکہ صبا کے چہرے پر فکر
 کی کوئی پرچھائی تلاشنے پر بھی اُسے نہیں ملی۔
 ”میرے لیے تو بچپن سے ہی ماحول سازگار
 نہیں رہا، اتنی چھوٹی فکر مت کیا کرو تم۔“ بڑی
 طمانیت سے کلائی میں پڑی چوڑی گھمانے لگی۔
 ”کیا کہہ رہی تھی تاجور؟ ابھی دیر تک ہنگامہ
 کر رہے گی۔“ صدام کڑوے لہجے میں بولا۔ چہرے
 کے خطوط ہنچ گئے۔
 ”کہہ رہی تھی وہ مان ہی نہیں سکتی کہ تم نے مجھ
 سے نکاح کیا ہے۔“ صبا ایسے ہی جیسے کسی معصوم بچے
 کی بے قوفی پر لطف اندوز ہو رہی ہو۔ صدام کی
 کڑواہٹ تسخیر میں بدل گئی۔
 ”جیسے اس کے ماننے نہ ماننے سے ہماری
 صحت پر فرق پڑے گا۔“
 ”حاکم نے تاجور کا منہ بند کروادیا ہے لیکن
 اب..... زخمی شیرنی ہے وہ۔“
 ”ایسے ہی ڈرامے پہلے بھی کرتی آئی ہے۔
 کچھ ہاتھ نہیں آتا اس کے۔“ صدام مطمئن اور
 پرسکون تھا۔ لیکن صبا!
 ”شاید اسے شیرنی نہیں کچھ اور کہنا چاہیے۔“
 وہ گہری نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر گاڑھے کسی اور
 سمت میں پینچی ہوئی تھی۔
 ”ہماری بلا سے..... تم اس کے حوالے سے فکر
 مند مت ہو۔“ صدام دیکھ نہیں رہا تھا کہ اُسے کسی چیز
 کی فکر نہیں تھی۔
 ”صدام کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟ اس گھر
 میں؟“ اتنی اچانک دسرعت سے بولی تھی کہ صدام کو
 یقین نہیں آیا۔
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس گھر میں مطلب
 کیوں؟“ حیرانی کے احساس نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر
 مجبور کر دیا۔ اس سے قبل صبا نے بھی اس گھر میں کوئی
 دلچسپی نہیں دکھائی تھی اور آج یکدم.....

تاجور نے اس کی نظروں میں اس کی کردار کشی کی تھی، وہ تاجور کو یہ بتائے بغیر تو نہیں رہ سکتی تھی کہ اُس سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب حالات اسے موقع دے رہے تھے۔ تاجور نہیں جانتی تھی.....

صبا نام تھا اس کا، اور اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔

☆☆☆

”مظفر بھائی کو کیا ضرورت تھی..... اتنا سارا کچھ۔“ سیسی بستر پر بکھری چیزوں کو بار بار دیکھتے ہوئے افسوس سے کہہ رہی تھی۔ بستر پر نئی چمچاتی ڈبوں میں پیک کچھ لفافوں سے نکلی چیزیں نظر آرہی تھیں۔ خوش رنگ لباس، نازک سی واچ، آریٹیشل چوڑیاں، گولڈ کے جھمکے، جو سر مشین، استری، پھول بوٹوں والے کمبل۔ سیسی کی جہاں تک نظر جانی گئی وہ فکر مند ہوتی گئی۔

”بہت پیارا ہے ہمارا بھائی۔ اسے بہنوں کا احساس ہے۔“ ثانیہ ایک ایک کھول کر دیکھ رہی تھی۔ محبت سے، خوشی سے۔ سیسی کو چپ لگ گئی۔ ”وہ کیا سمجھتا ہے بہنوں کو اس کا احساس نہیں ہوگا؟ میں نے کب ڈیمانڈ کی تھی؟“

”تمہارے ڈیمانڈ نہ کرنے یا انکار کرنے سے کیا ہو جائے گا، یہ تو دستور دنیا ہے۔ لوگوں کو دلہن سے زیادہ دلہن کا جہیز دیکھنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ بھائی سرخرو ہونا چاہتے ہیں، کوئی یہ نہ سوچے کہ ان کے ہوتے ہوئے.....“ ثانیہ سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے حقائق بیان کر گئی۔ وہ اپنجانے کس چیز کی طرف متوجہ ہوتی تھی کہ چپ کر گئی تھی۔

”ہمارا دنیا سے کیا لینا دینا۔ ہتا نہیں کتنے پیسے ضائع کیے ہوں گے۔“ وہ افسردہ سی ہوئی۔

”تو جی ضائع کیوں کیے۔ تمہاری ضرورت کی چیزیں ہیں پتی۔“ ثانیہ نے گویا سر پٹا۔

”ضرورت موجودہ چیزوں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے، جب گھر ایک ہو تو کیا پرانی کیا نئی۔“

”جی نہیں! نئی دلہن..... نئی چیزیں۔“ اس نے رٹ لگائی۔

”تم نہیں سمجھ سکتیں.....“ اس نے نظریں ہٹالی تھیں۔ ثانیہ اپنا کام ترک کر کے کھڑی ہو گئی۔

”مسئلہ کیا ہے بھئی؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے نا، اور تمہارا چہرہ اتر گیا۔“ وہ مصنوعی تیوریاں چڑھائے ڈپٹنے والے انداز میں تفتیش کر رہی تھی۔

سیسی گہرا سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی۔ آنکھیں زمین پر کچھ کھوج رہی تھیں۔ آواز مدہم۔ ”مجھے بے جان چیزوں سے خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔“

”تو پھر تمہاری خوشی کس میں ہے؟“ ثانیہ نے اسے بولنے کا موقع دیا۔

”مظفر بھائی خود بھی تو آسکتے تھے، یہ چیزیں بھجوانے کے بجائے.....“ سیسی کی بات پر ثانیہ کے ہونٹ سکڑے۔

”اوہ! تو یہ بات تھی۔“ اس نے خود کلامی کی۔

”میں جانتی ہوں اس کے لیے وہاں حالات سازگار نہیں ہیں، وہ قدم جمانے کی تگ و دو میں ہے۔ اس نے اسے لیے بہت کچھ کرنا ہے، اسے وقت بھی لگے گا..... مگر جتنے پیسوں میں اس نے یہ سب خریدا۔ اتنے میں ایک ٹکٹ تو آ ہی جاتی۔“ املتا اس پر اترتی شام کی طرح سیسی کے لہجے میں بھی کئی رنگ ملے جلے تھے۔ ثانیہ اس کی کیفیت سمجھ گئی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کیا ان کا دل نہیں کیا ہوگا..... پردیس میں تو یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت محسوس ہوتی ہیں۔“ ثانیہ نے نرمی سے اس کی بات میں اضافی کیا تھا۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

”بھائیوں کے ارمان بھی تو ہوتے ہیں بہنوں کو اپنے سائے میں رخصت کرنے کے..... اور معین کے ساتھ تو.....“ کہتے کہتے وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔

بڑے بڑے موقعوں پر حالات کی سختیاں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے کتنا ترسادیتی ہیں۔ وہ سوچتی گئی۔ ثانیہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا

”کرنے دو اُسے..... بھائی ہے تمہارا اور بھائی ہی کرتے ہیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اُس نے ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے کتنی محبت کرتا ہے وہ تم سے.....“

”اللہ پاک ایسے ہمیشہ سلامت رکھے۔“ یہی نے دل سے دعا دی تھی۔ اماں نے دل سے آمین کہا..... وہ اٹھ کر چلی گئیں تو یہی ایک ایک چیز ترتیب سے اٹھانے لگی کہ احتیاط سے اندر رکھ دے۔ اسی وقت نوشاہہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس رکی۔ ”میں یہ سامان رکھ دوں؟“ تائی جی کے سلوک کے باوجود بچوں میں بہت خلوص تھا۔ یہی نے اس کے بھرے بھرے گالوں پر انگلیاں مس کیں۔

”تم کھیلو، میں کر لیتی ہوں۔“ ”آپ کا موڈ اچھا ہے نا؟“ وہ نجانے کیوں پوچھنے لگی۔ یہی کو ہلکی سی حیرانی ہوئی۔ ”ہاں! تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ وہ متوجہ ہو گئی تھی۔

”معین بھیا پوچھ رہے ہیں کہ..... تمہاری یہی ماجی کا موڈ اچھا ہوا کہ نہیں؟“ وہ بتا کر پیچھے دیکھنے لگی۔ یہی کی اب بھی نگاہیں بھی اس کے تعاقب میں پیچھے کو گئیں۔ معین اپنے کمرے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ نجانے کب سے..... شاید اُسے دیکھتے ہوئے، یا کچھ سوچتے ہوئے..... اس کے چہرے پر نرم نرم سے تاثرات تھے۔ یقیناً مسکراہٹ کی چھایا..... یہی نے فوراً نظریں جھکا میں، دل خوش گمانیوں کی لے پر دھڑکا.....

جب سے شادی کا ذکر دوبارہ سے چھڑا تھا، وہ اپنا وہم تصور کر رہی تھی کہ معین کے رویے میں بدلاؤ آ گیا ہے۔ لیکن نہیں! یہ صرف اُس کا وہم نہیں تھا..... وہ یقیناً ان دونوں کے رشتے کو لے کر سوچ رہا تھا۔ اور اُسے اس رشتے کی فضا میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہی کپکپاتی مسکراہٹ کے ساتھ سامان سمیٹنے

تھا۔ ”ابھی تم نے خود کہا کہ پردیس میں کچھ بھی بہت آسان نہیں..... وہ تو فی الحال وہاں اسٹبل بھی نہیں ہو سکے۔ تو اپنی جدوجہد کو اس موڑ پر چھوڑ کر وہ کیسے آسکتے تھے؟“ ثانیہ نے رسائیت سے اس کی توجہ دوسری طرف لگائی تو یہی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“ ”مجھے یقین ہے وہ یہ چیزیں بہت خوشی سے خریدتے رہے ہوں گے، اب فون کریں گے تو تم انہیں اداس کرنے کے بجائے خوشی کا اظہار کرنا..... پھر دیکھنا ان کی خوشی کتنی دو چند ہوتی ہے۔ محنت وصول ہو جائے گی۔“

”ہاں ایسا ہی ہوگا۔“ یہی اداسی جھٹک کر مسکرائی دی۔ ثانیہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”اور میں بتا رہی ہوں کہ اس میں سے سب سے پیارا سوٹ میں لوں گی، دلہن کی اکلوتی بہن ہوں..... دلہن سے زیادہ پیارا نظر آنا چاہیے۔“ وہ ملبوسیات پر نظر دوڑاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی تھی۔ یہی ہنسنے لگی۔

”اور یہ تو تم جانتی ہو کہ جو دلہن سے زیادہ پیارا نظر آنا چاہیے وہ.....“

”جپ! کچھ بھی مت بولو آگے.....“ وہ بری طرح جھینپ گئی اور یہی کو اچھی طرح گھورا۔ یہی کی جواب سے پہلے اماں ان کی جانب آتی نظر آئیں تو وہ خفاسی ہوئی ہوئی چلتی بنی۔

”سنجالیں اپنی بیٹی کو، اداسیاں پھیلائے بیٹھی ہے۔“

”منظر نے کتنی محبت سے یہ سب بھیجا ہے۔ ایک ایک چیز قیمتی.....“ ان کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ بیٹے کی پسند پر فخر، یہی انہیں دیکھے گئی۔

”شادی کا خرچ الگ اس پر پڑے گا، مجھے بس فکر ہو رہی تھی۔“ وہ دھیسے لہجے میں بولی تو اماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

لگی۔ اس کے ذہن میں شاملہ کوہی اپنی باتیں گونجنے لگی تھیں۔

☆☆☆

سردیوں کی شامیں اتنی مختصر آنے لگی تھیں کہ پلک جھپکتے ڈوب جاتیں۔ حاکم جانوروں کی چارا ڈال رہا تھا، تاجور باڑے میں آئی تو آگے بڑھ کر باہر کو کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ پھر جھاڑو اٹھا کر احاطے کی صفائی کرنے لگی۔ رات کو جانور اندر باندھنے کی بعد صحن کی صفائی کر دی جاتی تھی کہ صبح کو صاف ستھری جگہ پر باندھ کر حاکم دودھ نکالتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ پھر بھی حاکم نے ایک نظر بھر کر اُسے دیکھا تھا۔

”میں نے تمہیں آواز تو نہیں دی..... میں کر لوں گا۔“ حاکم کی آواز پر لمبے بھر کو تاجور کا ہاتھ تھا۔ پھر اسی رفتار سے شروع ہو گیا۔

”یہ میرا کام ہے کسی کے بلانے یا نہ بلانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے بھی میں ہی کرتی ہوں۔“

”لیکن آج اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ تاجور پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

”آج کون سی نئی بات ہوگئی ہے؟“ وہ تیزی سے کچر ایک طرف سمیٹتی جا رہی تھی۔

”یہ بات مجھے تم سے پوچھنی چاہیے، تمہارا رویہ کہہ رہا ہے کہ آج کوئی نئی بات ہوگئی ہے۔“ حاکم نے اس کی بات پکڑ لی۔ تاجور نے بہت دقت کے بعد خود کو ہنوز سکون رکھا تھا۔

”سوال آپ نے کیا ہے، جواب میری طرف سے بنتا نہیں..... میرے لیے سب معمول کی بات ہے، کوئی بڑی بات نہیں۔“

”لیکن تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ یہ سب تم اپنی مرضی سے نہیں جبراً کر رہی ہو۔“ حاکم اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاجور کے حلق میں کچھ انک گیا۔

”میرے چہرے کو شاید بے بسی کی داستان سنانے کی عادت ہوگئی ہے۔ جب ہی ہر کوئی لطف

لینے کے لیے اپنی مرضی کی کہانی بنا لیتا ہے۔“ اس کے جواب پر حاکم نے ایک گہری سانس خارج کی۔ تاجور کوئی عام نہیں تھی، وہ ہمیشہ بہت مشکل ثابت ہوتی تھی۔

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ میں نے تمہارے چہرے پر بے بسی دیکھنے کے لیے یہ نہیں کیا۔ تم خود کو خود تکلیف دے رہی ہو تاجور..... چیزیں اتنی پیچیدہ نہیں ہوتیں جتنی ہم انہیں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے ہاتھوں کر لیتے ہیں۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر اور لفظ لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا۔ تاجور مسکرا دی۔

”جس کی زندگی میں تکلیف لکھ دی گئی ہو، پھر وہ اسے کسی اور سے مل رہی ہو یا خود اپنے آپ سے..... کوئی کیا کر سکتا ہے۔“

”یعنی تم اپنے فیصلے پر قائم رہو گی؟“

”میں نے کوئی فیصلہ کیا ہی کب ہے حاکم؟“ وہ بیٹھے بیٹھے سر اُونچا کر کے اس لمبے چوڑے مرد کو دیکھنے لگی۔ ”میری زندگی کے سارے فیصلے تو آپ کے ہاتھوں ہوتے آئے ہیں..... میں تو وہ بے جان چیز ہوں کہ جس کی اُف کرنے کی بھی کوئی اوقات نہیں ہے۔“

”وہ بھی اس لیے کہ تم مجھے غلط سمجھتی رہی ہو، میں نے جب بھی کوئی بات کی تم نے سرے سے میری ہی مخالفت کی۔ اگر تم نے بھی سچے دل سے میری کسی بات کو تسلیم کیا ہوتا تو تمہیں یہ شکوے شکایتیں نہ ہوتیں۔ مگر تاجور تمہیں میں نہیں سمجھ سکتا.....“ وہ افسوس سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ تاجور کے چہرے پر اس سے دو گنا افسوس اُٹھ آیا تھا۔

”میں نے کب آپ کی بات نہیں مانی؟ ابھی بھی آپ کے منہ سے یہ بات.....“

”بات ماننے اور تسلیم کرنے میں فرق ہے۔ تم مجبور ہو کر مان تو لیتی ہو مگر تمہیں غلط تو ہمیشہ میں ہی لگ رہا ہوتا ہوں۔“

”اسی بات ہے تو.....“ تاجور خواہ مخواہ ہنس دی۔ ”میں بھی آپ کی اُمیدوں پر پوری اُتر ہی نہیں

چاپ بیٹھ گئی۔
”کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟“ وہ اس سے پوچھنے لگا۔ وہ دونوں بھی ساتھ کھانا کھاتے تھے، ورنہ تاجور اس کا کھانا ختم ہونے تک سامنے ضرور بیٹھی رہتی تھی۔
”نہیں..... میں کھانا کھا چکی ہوں۔“ تاجور نے عام سے انداز میں جواب دیا۔ حاکم کو نجانے کیوں بے یقینی کا سامنا کرنا پڑا۔

”میرے آنے سے پہلے؟“ اُسے برا لگا تھا۔
تاجور اس کی طرف دیکھے بغیر بولتی گئی۔

”جی میں نے مغرب کے بعد کھا لیا تھا اس وقت بھوک نہیں ہے، پھر بچے بھی اس وقت تنگ کرتے ہیں..... آپ کھالیں، میں دودھ گرم کرتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے اٹھ کر قدم قدم چلتی باہر آ گئی۔ اسی وقت صبا خان کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی تاجور کے پاس آئی۔

”تاجور! صدام کے لیے کھانا دے دو۔“
تحکمانہ لہجہ تھا، تاجور کی ہنویں تن گئیں۔

”تم سے کس نے کہہ دیا ہے کہ میں اس گھر کی ملازمہ ہوں؟“ تاجور کے سر دلچھے نے صبا کو ایک دم ہوشیار ہونے پر مجبور کر دیا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے، میں تو کھانا مانگ رہی ہوں؟“ وہ ایک نظر حاکم پر ڈال کر مظلوم سی بن کر بولی۔

”کون سا کھانا؟ میں نے تو تمہیں کوئی کھانا بناتے نہیں دیکھا..... اور اگر بالفرض تم نے بنا ہی لیا ہے تو مجھ سے کیوں طلب کر رہی ہو۔ باورچی خانہ تم نے دیکھ ہی رکھا ہے۔“ وہ بے مروتی سے دو ٹوک انداز میں بول رہی تھی۔ صبا کے گویا طبق روشن ہو گئے۔

”میں کیوں کھانا بناؤں گی تاجور! ایک گھر میں اب دو دو چولہے جلیں گے کیا..... کھانا ہمیشہ تم ہی بناتی ہو۔“ صبا حیرت زدہ لگ رہی تھی۔ تاجور کو صاف ڈرامہ لگی..... یا ٹک باز!

”بناتی تھی، اب اپنا اور اپنے شوہر کا کھانا تم

سکتی۔ ہماری زندگی اسی طرح چلتی ہے.....“ وہ اب منہ موڑ کر دوسری سمت سے صفائی کرنے لگی تھی۔
حاکم کچھ دیر اس کی پشت کو تکتا رہا۔

”تم خوش تو نہیں ہو؟“ تاجور نے حاکم کی بات سنی۔ کتنی ہی دیر اُس سے کچھ بولا نہ گیا۔

”میری خوشی کی پروا کس کو ہے؟“ اس نے خود کلامی سی کی تھی۔ مگر حاکم نے سن لیا۔ اسے اس درجے کی ناشکری سخت ناگوار گزرتی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں چپ رہ گیا۔

”جس دن تم اپنا دل کشادہ کرو گی، خوشی اتنی مشکل نہیں رہے گی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہوں گے۔“ تاجور نے حکم عدولی نہیں کی۔ حاکم اتنی روکھی گفتگو سے اکتا گیا اور اکتا کر اس کے ہاتھ سے جھاڑو لے لیا۔

”جاؤ جا کر بچوں کو دیکھو..... یہ کام ہو جائے گا۔“ تاجور اب کی بار ہاتھ جھاڑتی ہوئی بے آواز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ ہاتھ دھو کر وہ بچوں کے کمرے میں گئی۔ پھر حمیدہ کو ایک نظر دیکھنے گئی..... صبا کے کمرے کا بلب جل رہا تھا مگر دروازہ بند تھا۔ صدام نے اپنے ڈیرے پر کسی نو عمر لڑکے کو رکھ لیا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں کھیتوں اور جانوروں کی حفاظت کرتا۔ وہ اب زیادہ تر گھر پر پایا جانے لگا تھا۔

یہ تو حاکم نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ جو بہانہ بختاور کے ہوتے ہوئے صدام کے لیے کارگر تھا وہ صبا کے آتے ہی بڑی آسانی سے ہوا ہو گیا۔ تاجور کے چہرے پر ایک نئی سے بھر گئی۔ حاکم عشاء ادا کر کے آیا تو تاجور کھانا گرم کر کے لے آئی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ اُسے کھانا رکھ کر واپس پلٹتا دیکھ کر حاکم نے آواز دی۔ تاجور گہرا سانس بھر کر پلٹی۔

”کچھ چاہیے؟“
”نہیں۔ بیٹھو تم یہاں.....“ کلامی تھام کر اُس نے چارپائی پر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ

صدام کے لیے.....“ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ صبا نے دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھام لیے..... ڈھٹائی میں اتنی تو تھی وہ۔ تاجور سنی پڑ گئی تھی۔ حاکم بنا ایک لفظ کہے ان دونوں کے بیچ سے نکلتا ہوا باہر چلا گیا۔ تاجور شکست خوردگی سے لب کاٹی اُسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

”مجھے بہت افسوس ہے تاجور.....“ صبا نے محظوظ انداز میں پیچ پیچ کیا تو تاجور کی ساکت پلکوں میں جنبش ہوئی۔

”تم اپنے ساتھ کتنا برا کر رہی ہو۔“

”مجھے تمہارے افسوس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سلگتے لہجے میں کہہ کر تاجور نے رخ موڑ لیا۔ صبا اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والی نہیں تھی۔

”افسوس مجھے نہیں تمہیں کرنا ہوگا..... بخدا تم مجھ سے پیٹے لے کر اچھا نہیں کر رہی ہو، تمہیں ابھی اپنے پچھتاوؤں کا احساس نہیں ہے۔“ اس کا انداز مذاق اڑاتا ہوا مگر لہجہ سنگین تھا۔ تاجور نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میری نظروں میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے، میں تم سے کوئی پنگا نہیں لے رہی..... میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں کہ جس کے دم پر تم یہاں آئی ہو اسی کے دم پر سب کچھ کرو۔ بھولنا بھی مت کہ اپنی زندگی میں، میں تمہیں کوئی مقام دوں گی۔“

”جانتی ہوں تم مجھے کچھ نہیں دے سکتیں۔“ صبا نے بھرپور یقین سے کہا۔ ”لیکن تاجور تم بہت جلد اپنی سب سے قیمتی چیز کھونے جا رہی ہو۔“

”مجھے دھمکی دے رہی ہو.....“ تاجور ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ صبا نے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔ وہ ہنسی بمشکل بیچ میں روک کر بولی تھی۔

”تم اگر یہاں آ ہی گئی ہو تو تمہیں لگتا ہے اب یہ گھر تمہارا ہے اور تم مجھ سے یہ چھین لو گی؟ واقعی تم یہ سوچتی ہو کہ میرے لیے یہ گھر قیمتی ہوگا؟“ وہ طنزیہ نگاہیں صبا پر جما کر سوال کر رہی تھی۔ صبا نے کچھ نہیں

خود بناؤ گی..... دوبارہ ذہن نشین کر لو۔ تم کوئی نئی نوکری دلہن نہیں ہونہ مجھے تمہارے چونچلے اٹھانے کا کوئی شوق ہے، مجھ پر پہلے سے ہی بہت ذمہ داریاں ہیں۔ میرے کاموں میں ہاتھ بٹانے کی تو مجھے تم سے کوئی اُمید نہیں البتہ اپنے کام اب تم خود کرنا سیکھو۔“ صبا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ چبا چبا کر بولی تھی۔ نجانے کس کا غصہ تھا جو تاجور کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا اور الفاظ سے نکل رہا تھا۔ لیکن حاکم کو یہ سیاری گفتگو مستند دیکھ کر صبا کو دلی خوشی محسوس ہو رہی تھی.....

”تاجور! تم مجھے پہلے بتا دیتیں تو تمہیں چھوٹا بننے کی ضرورت بھی نہ پڑتی میں خود سب دیکھ لیتی۔“ وہ دھیرے سے بولنا شروع ہوئی مگر تاجور نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے بڑا بننے کی ضرورت نہیں کم از کم تمہاری نگاہوں میں..... رہا سوال دوسرا تو شوق سے کرو، تمہارے کام ہیں، تمہیں ہی کرنے ہیں۔“

”تو میں کب انکار کر رہی ہوں۔ میں تو بس سارا دن اماں کے پاس بیٹھی رہی، مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم لوگ تمہاری آنکھوں میں یوں بھی کھل سکتے ہیں۔“ صبا کی آواز میں افسردگی سے کھل گئی تھی۔ تاجور متاثر ہوئے بغیر سکون سے بولی۔

”میری احساس دلانے کے لیے ہی تو میں نے تمہارا کھانا نہیں رکھا صبا! اب مجھے یقین ہے کہ تمہیں اپنی ذمہ داری ہمیشہ یاد رہے گی۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بیٹھے سے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ صبا کے چہرے پر کچھ لہرایا۔ اس نے دانت پیسے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی.....

”کھانا.....“ حاکم تاجور کا برتنوں میں لا کر رکھا کھانا صبا کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اُس نے شاید کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، وہ اسی طرح ڈھکا ہوا تھا جس طرح تاجور رکھ کر آئی تھی۔

”مگر حاکم بھائی.....“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ لے جائیں“

تمہارے پیٹ میں ٹھہرتی ہی نہیں جب تک مجھ سے ہزار زاویے سے اُس کو ڈسکس نہ کرلو۔“ سیسی نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ شائلہ ہمیشہ سے زیادہ خوش خوش اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”سچ میں یار! تمہارا ہی آسرا ہوتا ہے۔ اوپر سے تم نے داخلہ بند کیا ہوا ہے، اب مجبوراً میں خود نہ آتی تو شاید گھر میں ہی کسی کو پکڑ کر میں نے بتا دینا تھا۔“ بات کے اختتام پہ دونوں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”بے وقوف لڑکی! جس طرح اب آئی ہو اسی طرح پہلے بھی تشریف لا سکتی تھیں۔“ سیسی نے اسے شرم دلانی مگر شائلہ کو شرم نہیں آئی۔

”میں کوئی فارغ نہیں بیٹھی میری جان! پرنٹ میڈیا آسان ہے، فی وی پر لکھنے کا ہمارا پہلا تجربہ ہے اور سننے میں آتا ہے کہ بہت دفعہ ایک چیز بار بار لکھوائی جاتی ہے۔ اس لیے میرا زیادہ تر وقت تالیپ ٹاپ کے آگے گزرتا ہے..... جلدی سے یہ آدھا کام مکمل ہو، تا کہ تمہاری شادی کی تیاریاں کر سکوں۔ باقی بعد میں سہی..... ثانیہ نے تمہیں بتایا ہی ہوگا؟“

”نہیں۔ وہ شاید فوراً واپس آگئی تھی۔ مجھ سے ذکر نہیں کیا تمہاری مصروفیت کا.....“ سیسی نے جواب دیا۔

”ہاں! ثانیہ کہاں مصروف رہتی ہے وہ بھی کم کم ہی تمہارے کام سے آتی ہے۔ شمریز اس کا پوچھ رہا تھا۔“ شائلہ نے نارمل سے لہجے میں کہا۔ سیسی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا؟“

”کہ ثانیہ بھی اب نظر نہیں آتی۔ تمہیں تو پتا ہے وہ تم دونوں کا کتنا پوچھتا ہے ایک دو دن تک غائب ہو جاؤ تو.....“ شائلہ مسکرا رہی تھی۔ سیسی خاموش ہو گئی۔ شائلہ کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ اُسے شمریز کے جذبات کا علم ہے..... سیسی نے بھی وقت آنے تک خاموش رہنے میں مصلحت جانی۔

کہا، صرف اس کے چہرے پر کچھ کھوجتی رہی۔

”تم جو مرضی کرلو! میرے لیے اس گھر میں کچھ بھی قیمتی نہیں ہے۔ اس لیے اپنے کھوکھلے الفاظ اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔“ وہ کہہ کر مزید رُکی نہیں اور ایک نگاہ غلط ڈال کر اپنے کمرے کی سمت بڑھنے لگی۔ صبا کی آواز نے تیزی سے اُس کا پیچھا کیا تھا۔

”کسی بھی چیز کی اہمیت کا اندازہ اُس کے چھن جانے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ احساس میں تمہیں دلاؤں گی.....“ تا جو ربرآمدے کے آخری کونے پر جا کر ٹھہر گئی۔ صبا خان وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

مثل بہشت کا بے داغ آسمان کبوتروں کی اڑان سے ڈھکا ڈھکا لگ رہا تھا۔ سورج کی نارنجی کرنوں کے ہمراہ کئی رنگ کے پرندے اپنے آشیانوں کے راستے پرواز کر رہے تھے۔ ایسے میں آسمان کے دامن میں پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کا شور گونج رہا تھا۔ دو کبوتر تھک ہار کر سیسی کی چھت کی منڈیر پر دوپل کو آ بیٹھے تو شائلہ نے اپنا آچل لہرا کر انہیں دوبارہ سے اڑا دیا۔ اور پھر انہیں فضا میں گم ہوتا دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”بھی بھئی دل کرتا ہے کہ کاش ہم پرندے ہوتے۔ بہت خوشی کے احساس کے تحت ہلکے دل کے ساتھ پورے آسمان کی سیر کرتے اور کتنی ہی وادیوں پر اپنی خوشی کے نقش چھوڑتے۔ وہ بات پھر بھی اتنی بڑی لگ رہی ہوتی ہے کہ یہ دنیا چھوٹی پڑتی معلوم ہوتی ہے۔“

وہ دونوں چائے کے کپ ہاتھ میں لیے چھت پر واک کر رہی تھیں۔ سیسی کا شائلہ کے گھر آنا جانا تھوڑا سا کم ہو گیا تھا..... وجہ اُس کے گھر میں اپنی مصروفیت۔ دوسری طرف شائلہ بھی اپنے پہلے ڈرامے پر کام کر رہی تھی۔ اس لیے بہت کوشش کے بعد آج خود چل کر آئی تھی۔

”تمہاری خوشی کو کسی کی نظر نہ لگے تم پہلے بھی تو مجھ سے شیئر کر سکتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کوئی بات

”خیر تم اپنی بات کرو۔ جس خوشی میں تم آسمان کا پرندہ بننے کی خواہش کر رہی ہو۔“ اس نے موضوع بدل دیا تو شائلہ کو اپنا من پسند قصہ سنانے کا خیال آیا۔

”ہاں خضر نے مجھے چین سیٹ گفٹ کیا سیکی! ہم دونوں نے شائدار سانچ کیا اور بہت ساری باتیں.....“ شائلہ نے ہاتھ پھیلا کر خوب صورت تاثرات کے ساتھ کہا۔ اس کے چہرے پر بکھرے انوکھے جذبوں کے رنگ اس تاریکی شام میں سیکی کو مبہوت سا کر گئے تھے۔

”واؤ! اس کا مطلب میرا شک ٹھیک نکلا۔“ سیکی گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو شائلہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”کیسا شک؟“
”خضر نے تمہیں کسی خاص پلان کے تحت بلایا تھا؟“

”مثلاً کیسا پلان؟“
”خضر نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟“
”ہا ہا ہا..... نہیں!“
”کوئی اشارہ یا اپنی محبت کا اظہار..... اپنے ساتھ کی یقین دہانی؟“
”نہیں.....“ شائلہ کی کھلکھلاہٹیں اونچی ہونے لگیں۔

”اچھا پھر تو ڈائریکٹ اپنی اماں کو بھیجنے کی اجازت لی ہوگی؟“
”یہ بھی نہیں ہوا.....“

”پھر تمہیں اپنی ماں سے ملوانے تو نہیں لے آیا؟“ سیکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اسٹاپ اٹ.....“ سیکی کے سوالات کے ساتھ چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر شائلہ کی آنکھوں میں ہنس ہنس کر پانی آ گیا۔ جبکہ سیکی..... اپنے تمام اندازے غلط ہو جانے پر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔
”ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر اور کیا ہوا ہے۔ تم ہی ایک ایک کر کے ساری بات بتا دو بھئی، مجھے مزید

اندازے نہیں قائم کرنے۔“
”تم میں بھی تو صبر نہیں ہے نا خاموشی سے کچھ سننے کا..... میں تمہیں ویسے بھی بتا ہی دیتی۔ میں کہہ رہی ہوں کہ یہ سب تو نہیں ہوا کیونکہ یہ سب ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔“ شائلہ نے انتہائی سکون کے ساتھ سیکی کو ابھٹن میں ڈال دیا۔ وہ کپ نیچے رکھ کر اسے گھورنے لگی۔

”کیوں بھلا اس چیز کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟ مجھے تو اپنے اندازے کے غلط ہونے کا افسوس ہو رہا ہے۔ بھئی بڑا بے وقوف ہے تمہارا خضر صاحب۔ کم از کم کہانیوں کے ہیرو ایسے تو نہیں ہوتے۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ شائلہ کو زور سے ہنسی آئی۔

”شٹ اپ سیکی.....“ اس نے بے وقوف کہنے پر اس کو مصنوعی گھوری سے نوازا۔

”خضر اور میرے درمیان جو کچھ ہے وہ جذبہ محسوس ہوتا ہے، ہمیں اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خضر نے جس چاہت سے مجھے تحفہ دیا ہے اور اپیشیل فیل کرایا ہے وہ اس کے پروپوز کرنے سے زیادہ قیمتی ہے میرے لیے..... اور جانتی ہو سیکی! وہ میرے لیے سیریس ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت سے میرے لیے بے پناہ محبت جھلکتی ہے۔ ہمیں لگتا تھا وہ صرف ہماری کہانیوں سے متاثر ہوا ہے..... یہ سچ ہے مگر وہ مجھ سے اب گہری محبت کرتا ہے۔“

شائلہ خیالوں میں خضر کا عکس دیکھ رہی تھی کہ سیکی کو اس کا لہجہ خواب ناک لگا۔ اور خود وہ محبت سے چور چور..... وہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے پیاری لڑکی!“
”ہاں یار! وہ کچھ دن تک بڑی ہے لیکن میرا کس طرح خیال رکھتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا..... اور کوئی بھی کہانی بڑھ کر اتنے باریک نقطے کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ آگے کہیں کسی قاری کو کوئی تشنگی محسوس نہ ہو۔ روز مجھ سے بات کیے بغیر اس کی رات نہیں ڈھلتی..... اور سیکی اب اس نے کہا ہے کہ وہ

بہت جلد مجھے کوئی سر پرانز دے گا۔ اور جانتی ہو وہ سر پرانز.....“ شائلہ نے بات ادھوری چھوڑی اور نیچلا لب دیا کر سیدی کو دیکھا۔ وہ جو بغور اسے سن رہی تھی پوچھنے لگی۔

”ہاں کیسا سر پرانز؟“

”وہ یقیناً اپنی ماں کو میرے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ اُس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے تم خود سوچو اس کے رشتے کی سفارش کے علاوہ بھلا اسے مجھ سے اور کون سی مدد چاہیے ہوگی؟“ وہ بھنویں اچکا کر سیدی سے تائید چاہنے لگی۔ سیدی نے بھی یقین کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو شائلہ! ویسے اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے، تھوڑی سی رعایت کے بعد ہیرو بن ہی سکتا ہے۔“ سیدی نے شرارت سے کہا تو شائلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”تم نا مجھ سے بری طرح پٹوگی.....“

”واہ! ہم پر اب یہ وقت آگیا ہے..... خیر میڈم، وہ تو اپنے حصے کا کام کر دے گا مگر تم نے کیا سوچا ہے؟ اس سے پہلے تو تمہیں بات کرنی ہوگی نا گھر میں..... یا اُس کی اماں کی آمد کے بعد کچھ سوچو گی؟ تم نے ارٹھ میرج کا رنگ دینا ہے۔“

”یار! مسئلہ تو فقط ایک ہی ہے کہ امی کا ارادہ پھپھو کی طرف ہے اور احمر کا جھکاؤ بھی میری طرف کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے..... میں جانتی ہوں کہ احمر اور خضر کا کوئی مقابلہ نہیں، خضر کا پلڑا بہت بھاری رہے گا۔ اور بابا کو تو میں جانتی ہوں کہ وہ میری مرضی تو ضرور جانیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ خضر کو انکار ہو سکتا ہے.....“ وہ پورے یقین کے ساتھ بولی تھی۔

”واہ بھئی! خوش نصیب لوگ.....!“

”سیدی تم خوش ہونا؟ آئی مین ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر..... کہیں کچھ غلط تو نہیں ہوگا؟“ وہ ذرا دیر کو سنجیدہ ہو کر دریافت کرنے لگی۔ سیدی اس کی فکر پر مسکرائی تھی۔

”میں مطمئن ہوں شائلہ! اور اللہ تعالیٰ نے تم دونوں کا نصیب لکھا ہے تو کہیں کچھ غلط بھی ہو تو آخر میں سب اچھا ہو جائے گا۔ خضر اور تم بہت خوش رہو گے..... میں چاہتی تھی کہ اللہ تمہارے نصیب بہت نیک کرے اور اب میں بہت خوش ہوں۔ تم دونوں کا کپل نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت ہوگا۔“

”تم تو ایک بہن کی نظر سے دیکھ رہی ہو۔ اس لیے یہی کہو گی.....“ شائلہ بری طرح جھینپ گئی۔ سیدی کی مسکان گہری ہوئی۔

”نہیں میں صرف بہن کی نظر سے نہیں دیکھ رہی۔ جس دن تمہاری بات ٹھہر گئی سب رشک کر رہے ہوں گے۔“

”ان شاء اللہ.....!“ شائلہ نے دل کی گہرائیوں سے کہا اور سیدی کی بات سچ ہو جانے کی دعا کی۔

”تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔ خضر کے پلے کا کام آل موسٹ مکمل ہو چکا ہے۔ میں کسی دن اُسے اسکرپٹ دے دوں گی..... وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوگا تو اس پر بات شروع کریں گے۔ میں نہیں چاہتی سیدی کہ اس سے پہلے کسی کو علم ہو جائے اور ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔ جب بات سیدھے طریقے سے آگے بڑھے گی تو کوئی اچھپائی کا راستہ ہی نکلے گا۔“ شائلہ سمجھ داری سے کہہ رہی تھی۔ سیدی نے اس سے اتفاق کیا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو! مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے والد اس رشتے کو کنفیڈر کریں گے۔ بس اپنی پھپھو والی سائیڈ کو سنبھال لیتا..... رہی بات خضر کے پروپوزل کی تو تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ تمہاری خضر سے یونیورسٹی میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرف شک نہیں جائے گا اگر تم راز ہی رکھنا چاہتی ہو تو.....“

سیدی نے اس کی بات میں اضافہ کیا تو شائلہ سرشاری سے ہال سمیٹتے ہوئے کر بولی۔

”میں دیکھ لوں گی کہ حالات جس دھارے پر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشنِ چلمن



نادرہ خاتون
قیمت - 300 روپے



رضیہ جمیل
300

میرا دل دستِ کوہِ گری



فوزیہ یاسمین
قیمت - 750 روپے



نسیم سحر قریشی
قیمت - 400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہوں گے کہ کون سی بات ہمارے حق میں بہتر رہے گی..... بہر حال تم اپنی طرف سے تیار رہنا میری لو اسٹوری میں ٹوئسٹ کے لیے۔ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ شائلہ نے اُنکی اٹھا کر یہی کو وارن کیا۔ یہی نے ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا۔

”میں آل ریڈی تیار بیٹھی ہوں۔ اور منتظر بھی تمہاری لو اسٹوری کے نئے ٹوئسٹ کی.....“

”فی الحال تو تم اپنی شادی کی تیاریاں کرو نیک دل کے ساتھ..... میں تمہارے لیے دعا گو ہوں۔ تم بتا رہی تھیں کہ معین کے رویے میں تمہیں تبدیلی محسوس ہو رہی ہے؟“

”ہاں میری جذباتی تقریر نے شاید اثر کر دیا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ پہلے کی بات اور ہوتی ہے..... شاید اُسے احساس ہو گیا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“ وہ نمی نمی مسکان کے ساتھ شائلہ کو دھیرے دھیرے بتانے لگی۔ شائلہ کے چہرے پر اطمینان پھیل رہا تھا۔

”ویسے اتنا بھی برا نہیں معین۔ بعد میں تم مزید سیدھا کر دینا، اگر مجھ سے ملنے میں کوئی پابندی لگائی ہو۔“

”ہا ہا..... ایسا نہیں ہوگا، تھوڑا سا غصیلا ہے مگر بات سمجھ بھی جاتا ہے۔“ یہی ہنسنے لگی۔

”چلو میری ٹینشن میں کچھ کمی ہوئی..... میری انمول دوست کی زندگی میں ہر خوشی ہونی چاہیے۔“ شائلہ نے بہت لاڈ سے اُس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں سے دونوں کے بال چمک رہے تھے۔ دونوں کی زندگیاں اہم موڑ پر آ گھڑی ہوئی تھیں۔

ایک کی لو اسٹوری شروع ہونے جا رہی تھی..... اور ایک کی اُلٹی گنتی شروع.....!!

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)